حقیقتِ عبودیّت
ترجمہ کتاب امام ابن تیمیہ رح
صدرالدین اصلاحی
دارالاشاعت نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن

افاداتِ علامہ ابن تیمیہؒ

مترجمہ

مولانا صدر الدین اصلاحی

اشاعتِ اول　　مارچ ۱۹۴۶ء　　تعداد ایک ہزار

شائع کردہ

دار الاشاعت نشأۃِ ثانیہ ملّے پلّی بلدہ حیدرآباد دکن

مطبوعہ

مطبع مکتبہ ابراہیمیہ کٹلمنڈی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	مقدمہ از مترجم	۳	۱۴	مخلوق کا معیار کمال	۷۳
۲	عبادات وعبودیت	۷	۱۵	عبدیت کے لحاظ سے لوگوں میں	
۳	مفہوم عبادت کی وسعت	۸		فرق مراتب	〃
۴	تخلیق انسانی کی غایت مقصود	〃	۱۶	سوال کرنے کی ممانعت	۷۸
۵	عبدیت بندے کے لئے بلند	۱۲	۱۷	کبار صحابہ کو سوال کی قطعی ممانعت	۸۰
	ترین مقام		۱۸	خدا ہی سے سوال کرنے کا حکم	۸۰
۶	دین اور عبادت کی لغوی تحقیق	۱۷	۱۹	حب غیر، بندگی غیر	۸۶
۷	عبدیت کی تحقیق	۲۳	۲۰	غیر اللہ میں انہماک، خدا سے	۸۹
۸	عبدیت کا تکوینی مفہوم	〃		تغافل۔	
۹	عبدیت کا دینی مفہوم	۳۲	۲۱	اشیاء مادی کی دو قسمیں	۹۴
۱۰	حقائق تشریعی وحقائق تکوینی	۳۳	۲۲	حب رسول کی حقیقت	۹۶
	میں فرق نہ کرنے کے نتائج	〃	۲۳	محبت الٰہی کی دو علامتیں	۹۸
۱۱	قائلین جبر کی گمراہیاں	۴۸	۲۴	جہاد کی حقیقت	۱۰۱
۱۲	ان گمراہیوں کا علاج	۶۵	۲۵	حب رسول اور محبت الٰہی کا	۱۰۲
۱۳	ایک اعتراض اور اس کا جواب	۶۸		معیار	

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۶	قلب انسانی کی خصوصیت	۱۰۴	۳۹	محبت الٰہی کے مفہوم میں افراط و تفریط	۱۲۸
۲۷	اسلام کی حقیقت	۱۰۷	۴۰	ان لغزشوں کا علاج اور محبت کا معیار	۱۳۲
۲۸	کبر و عبدیت میں منافات	″	۴۱	اہل زہد و ریاضت کی خام خیالیاں	۱۳۷
۲۹	کبر مستلزم شرک ہے	۱۰۹	۴۲	آفات نفس (شرک)	۱۳۹
۳۰	فرعون کی مثال	۱۱۰	۴۳	حب جاہ و مال	۱۴۰
۳۱	یہود و نصاریٰ کی اصل گمراہیاں۔	۱۱۳	۴۴	فتنہ وحدۃ الوجود	۱۴۵
۳۲	ہر نبی کا دین اسلام تھا	۱۱۵	۴۵	فنا	۱۴۶
۳۳	اسلام دین کائنات ہے	۱۱۸	۴۶	کلام مشائخ کی صحیح تاویل	۱۵۲
۳۴	ابراہیم خلیل عبدیت کاملہ کا نمونہ۔	۱۲۰	۴۷	وحدۃ الشہود	۱۵۴
۳۵	خلت کا مفہوم	۱۲۲	۴۸	ذکر الٰہی کے بدعی اور غیر مشروع طریقے	۱۵۶
۳۶	محبت اور خلت میں فرق	۱۲۳	۴۹	سلامتی دین کی راہ	۱۶۱
۳۷	ایک خیال عام کی تردید	۱۲۴			
۳۸	لذت اور حلاوت ایمانی	۱۲۵			

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

جب سے اسلامی تحریک پر انحطاط کا عمل شروع ہوا ہے اس وقت سے نہ صرف یہ کہ اس کے علم برداروں کی سیرتیں ہی غیر اسلامی سانچوں میں ڈھلتی جارہی ہیں بلکہ دین کے متعلق ان کے تصورات بھی غلط سے غلط تر ہوتے جارہے ہیں، اور وہ اصطلاحات دینی جو تعلیمات اسلامی میں دھڑکتے ہوئے دل کی حیثیت رکھتی تھیں، اور جن کے صحیح مفہوم سمجھنے ہی پر دین کا سمجھنا موقوف تھا، ایک ایک کرکے تحریفِ معنوی کی نذر ہو کر رہ گئیں اور ان کے تصوّر کو انتہائی حد تک ناقص اور بے روح کر کے رکھ دیا گیا۔ فالی اللّٰہ المشتکی۔

اِستقراء بتاتا ہے کہ اس کارنامہ کی سرانجام دہی میں دو چیزوں نے سب سے بڑھ کر حصّہ لیا۔ ایک تو وہ مُبتدعانہ تصوّف جس کا مایۂ خمیر یونانی اور ہندی فلسفۂ روحانیات سے اٹھایا گیا ہے۔ دوسری چیز وہ جاہلی تہذیب جس نے

اپنی فکری اور سیاسی طاقتوں کے زور سے مذہب کو بے خانماں بنا ڈالا
اور اس سطحِ ارضی سے بے دخل کر کے اس کو زمین اور آسمان کے درمیان
معلّق کر رکھا ہے، اور اب اس کو انسان کی دنیوی زندگی کے کسی مسئلہ میں
لب کشائی کی اجازت دینے کی قطعی روادار نہیں۔

ان دونوں چیزوں میں سے پہلی چیز جہاں تک اسلام کا تعلق ہے دوسری
سے بہت پرانی ہے۔ اور اسلام کی سادہ لیکن ہمہ گیر تعلیمات پر اس کا خاموش
حملہ مدتوں سے جاری ہے۔ اس حملہ کی روک تھام میں جن علمائے حق اور رسولِ خدا
کے جن وارثین صادقین نے مجاہدانہ کارنامے انجام دئیے ہیں ان میں شیخ الاسلام
امام ابن تیمیہؒ کا نام نامی نمایاں حیثیت کا مالک ہے جن کا علم اور عمل ہمارے
تعارف اور اعتراف دونوں سے بے نیاز ہے۔ امامِ موصوف کا زمانہ اگر ایک
طرف سیاسی طوفانوں کا زمانہ تھا تو دوسری طرف علم اور فلسفہ اور تصوف کے
نام پر اٹھائے ہوئے فتنے بھی ایک قیامت برپا کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ بدعت نواز
متصوفین نے "عبادت اور عبودیت" کے متعلق عجیب و غریب خیالات کی اشاعت
شروع کر رکھی تھی۔ موصوف نے ایک سائل کے جواب میں دین کی اس بنیادی حقیقت
سے پردہ اٹھاتے ہوئے اس پر پوری شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی اور اس موضوع
پر ایک مستقل رسالہ مرتب فرما دیا جس کا نام "العبودیۃ" ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں عبادت اور عبودیت کے حقیقی مفہوم
سے اس سے کہیں زیادہ ناآشنائی پائی جاتی ہے جتنی کہ امام ابن تیمیہ کے زمانہ میں
تھی، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ امامِ ممدوح کے ان ارشادات کو اردو میں منتقل

کر کے عام لوگوں کے استفادہ کے قابل بنا دیا جائے۔ اگرچہ ایک
مصنف جو کچھ لکھتا ہے اس میں وہ اپنے وقت کے حالات اور مقتضیات
ہی کو سامنے رکھ کر لکھتا ہے اِس لئے ہر تصنیف اپنے زمانہ تحریر ہی سے
کلی مطابقت رکھ سکتی ہے اور یہی اُصول رسالۂ مذکور پر بھی صادق آتا
ہے، لیکن اس کے باوجود اس کے اندر جو اُصولی باتیں اور بنیادی حقائق
بیان کئے گئے ہیں ان کی افادیت آج بھی اتنی ہی مطابقِ حال اور
برمحل ہے جتنی پہلے تھی۔ چنانچہ اس رسالہ کا اردو میں ترجمہ کر دیا گیا جو
ماہنامہ "ترجمان القرآن" کی مسلسل چار اشاعتوں میں "عبادت اور
عبودیت" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اب وہی مضمون یکجا کتابی صورت
میں شائع کیا جا رہا ہے۔ خدا کرے کہ اس کے ذریعہ عام لوگوں کو معرفت
حق کی توفیق ارزانی ہو۔

اصل مضمون کی افادیت کے لئے امام ابنِ تیمیہ کا نام بجائے
خود ایک ضمانت ہے۔ ترجمہ کے متعلق اتنا عرض کر دینا البتہ ضروری
ہے کہ اس میں الفاظ کی پابندی نہیں کی گئی ہے، بلکہ آزاد ترجمہ ہے
نہ صرف آزاد بلکہ بعض مقامات پر فہم مُدعا کی آسانی کے لئے کچھ الفاظ
اور جملے بڑھا بھی دیے گئے ہیں، جہاں کہ موجودہ معیار تصنیف کے
عبارت میں ابہام اور بے ربطی معلوم ہو رہی تھی۔ اسی طرح بعض مقامات
پر حذف اور تلخیص سے بھی کام لیا گیا ہے جہاں کہ غیر ضروری اطناب
اور تکرار بیان نظر آ رہی تھی۔

امید ہے کہ ابنِ تیمیہؒ جیسے مستند امام ملت اور واقفِ اسرارِ شریعت نے عبادت و عبودیت، محبتِ الٰہی و محبتِ رسول اور اتباعِ سنت و جہاد فی سبیل اللہ کے متعلق جو بصیرت افروز باتیں کہی ہیں وہ اِس دورِ فتن میں، جب کہ دین اور مصطلحاتِ دین کی نئی نئی اور محرّف تعبیریں بیان کی جارہی ہیں، قارئین کے لئے تنویرِ نظر کا کام دیں گی۔

صدرالدین اصلاحی
۴ ربیع الثانی ۱۳۶۵ھ

عبادت اور عبودیت

از افاداتِ علامہ ابن تیمیہؒ

مترجمہ

(مولوی صدر الدین اصلاحی)

امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ آیتِ کریمہ
یَا اَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ (بقرہ-۳)۔
لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔

کا کیا مطلب ہے؟ "عبادت" کا کیا مفہوم ہے؟ اس کے اصول و فروع کیا ہیں؟ آیا دین پورے کا پورا اس لفظِ "عبادت" میں داخل ہے یا نہیں۔ اور یہ لفظ دین کے تمام کلیات و جزئیات کو محیط ہے یا دین کے کچھ شعبے اس کی حدود سے خارج ہیں؟ عبودیت کی حقیقت کیا ہے؟ کیا عبودیت ہی کسی مخلوق کے شرف و مجد کا منتہائے کمال ہے یا اس سے بلند تر کوئی مقام اور بھی ہے؟

امامِ موصوف اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

مفہومِ عبادت کی وسعت | اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ "عبادت" ایک جامع لفظ ہے اس کے اندر وہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال واقوال داخل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور جو اس کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں مثلاً نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، راست گوئی، امانت، صلہ رحمی، دیانت اطاعتِ والدین، ایفائے عہد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد فی سبیل اللہ اور پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں اور مملوکوں کے ساتھ ــــ خواہ یہ مملوک انسان ہوں خواہ بہائم ــــ نیک سلوک، دعا، ذکرِ الٰہی، تلاوتِ قرآن اور اسی قسم کے تمام اعمالِ صالحہ صورتِ عبادات کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ نیز اسی طرح اللہ اور اس کے رسول کی محبت رحمتِ خداوندی کی امید اور عذابِ الٰہی کا خوف، خشیت، انابت، اخلاص، صبر، شکر، توکل، اور تسلیم و رضا وغیرہ تمام صفاتِ حسنہ عبادت کی حدود میں شامل ہیں۔

تخلیقِ انسانی کی غایت مقصود | اور عبادت ہی اللہ تعالیٰ کی وہ غایت محبوب اور مقصدِ وحید ہے جس کے لئے اس نے یہ سارا کارخانۂ عالم پیدا کیا جیسا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (ذاریات ـ ۳)

میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا تاکہ وہ میری عبادت کریں۔"

اور دنیا میں جو رسول بھی بھیجا گیا، اسی غایت کے ساتھ اور اسی مقصد کی تذکیر و تبلیغ کے لئے۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ

اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

پھر یہی بات حضرت ہود، صالح، شعیب اور دیگر تمام انبیا علیہم السلام نے اپنی اپنی قوم سے کہی۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ؕ

ہم نے ہر قوم میں ایک پیغامبر بھیجا (یہ پیغام دے کر) کہ اے لوگو! اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے دور رہو۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ؕ

اے نبی! تم سے پہلے ہم نے جس پیغمبر کو بھی بھیجا اُس کو ہم نے یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس میری ہی عبادت کرو۔

اِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ؕ

دراصل تم لوگوں کی یہ امت ساری کی ساری ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں سو میری عبادت کرو۔

یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہنی چاہئے کہ ان آیات میں "فاعبدون" کا خطاب صرف عوام ہی یعنی اُمتیوں ہی کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ خود اس دعوت کے داعی اور اس پیغام کے مُتبع انبیائے کرام بھی اس کے مخاطب اور مکلّف ہیں، جس کی تصریح ایک دوسرے مقام پر اس طرح کی گئی ہے۔

يَاأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ۝ (مومنون-۴)

اے رسولو! پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک کام کرو بلاشبہ میں تمھارے اعمال سے واقف ہوں۔

ایک دوسری آیت میں اسی چیز کو مزید وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ اس فریضہ کی ادائیگی زندگی کے آخری لمحوں تک کے لئے واجب ہے!

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ

(حجر-۶)

اے محمد! اپنے رب کی عبادت کرتے رہو یہاں تک کہ "یقین" (موت) کا وقت آجائے۔

پھر یہی عبادت وہ چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ انبیا اور ملائکہ کی صفتِ کمال کے طور پر مدّاحانہ ذکر کرتا ہے:۔

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ٥ (انبیاء - ۲)

آسمان اور زمین میں جو لوگ ہیں وہ سب اسی کے ہیں جو (ملائکہ) اس کے حضور میں ہیں وہ نہ کبھی اس کی عبادت سے سرتابی کرتے ہیں نہ کاہلی کرتے ہیں رات دن اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اس میں ذرا بھی نہیں تھکتے۔

فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ٥

جو ملائکہ تیرے رب کے پاس ہیں وہ کبھی اس کی عبادت سے کبر و اعراض نہیں کرتے ہمہ دم اس کی تسبیح کرتے رہتے اور اس کی جناب میں سربسجود رہتے ہیں۔

اس کے بالمقابل جو لوگ کائناتِ عالم کی اس غایتِ آفرینش کو پورا نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بندگی اور سرفگندگی کا اظہار کرنے کے بجائے استکبار سے کام لیتے ہیں ان کی اللہ تعالیٰ یوں مذمت کرتا ہے۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ

جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ہ

اور تمھارے رب نے فرمایا کہ مجھے پکارو، میں تمھاری سنوں گا بے شک جو لوگ عبادت سے منہ موڑتے ہیں وہ دوزخ میں ذلیل و خوار داخل ہوں گے۔

عبدیت بندے کے لئے بلند ترین مقام | عبادت ہی جب تکوینِ عالم کی غرض و غایت ٹھیری تو اس غرض کا پورا کرنا ہی خالقِ ارض و سما کی خوشنودی کا باعث ہوا، اور کسی مخلوق کی انتہائی برتری اور برگزیدگی کے معنی یہ ہوئے کہ وہ عبدیت کے انتہائی مقام پر پہنچا ہوا ہے چنانچہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ جب اپنے خاص اور مقرب بندوں کا شفقت و محبّت اور اعزاز و تکریم کے ساتھ ذکر کرنا چاہتا ہے تو انھیں اسی صفتِ عبدیت سے متصف کرتا ہے اور اُن کا تذکرہ "عبد" کے لفظ سے کرتا ہے۔

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ ہ (دہر - ۱)

ایک چشمہ جس سے عباد اللہ (اللہ کے بندے) سیراب ہوں گے۔

عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا

رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں۔

جب شیطان نے اپنی ملعونیت کی سزا سُن کر اللہ کے حضور میں کہا کہ میں اس کے بدلے میں تیرے بندوں کو سبز باغ دکھا دکھا کر گمراہ کروں گا تو بارگاہِ ربّ العزّت سے ارشاد ہوا:۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ (حجر - ۳)

بے شک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا کوئی بس نہ چلیگا بجز اُن گمراہوں کے جو تیری اتباع کریں۔

ملائکہ کے متعلق فرمایا :-

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا سُبْحَانَہٗ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ ...... وَھُمْ مِنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ ٥ (انبیاء - ۲)

اور یہ کافر کہتے ہیں کہ رحمٰن نے اپنی اولاد بنائی ہے۔ پاک اور منزہ ہے اللہ تعالیٰ ایسی باتوں سے بلکہ وہ تو اللہ کے مکرم بندے ہیں اور وہ خوف سے ہمیشہ لرزاں و ترساں رہتے ہیں

اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ......

آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے وہ اللہ کے حضور عبد اور بندہ ہو کر حاضر ہو گا۔

حضرت مسیح کے بارے میں جن کے متعلق نبوت کے ساتھ الہیت کا دعویٰ بھی کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے:۔

اِنْ ھُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْہِ (زخرف - ۶)

وہ تو محض ایک بندہ ہے جس پر ہم نے انعام کیا۔۔

چنانچہ اسی لیئے کہ کہیں مسلمان پیغمبر آخر الزماں کے معاملہ میں یہی غلطی نہ کر بیٹھیں کہ انھیں ان کے اصلی مقام ـــــ مقامِ عبدیت ـــــ سے ہٹا دیں۔ آنحضرتؐ نے اپنی امت کو کھلے لفظوں میں وصیت فرمادی کہ:۔

لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ عیسیٰ ابن مریم۔ انما انا عبدٌ فقولوا عبد اللہ ورسولہٗ (بخاری)

میری مدح وستائش میں غُلو نہ کرنا جیسا کہ نصاریٰ نے عیسٰی ابنِ مریم کو سراہ کر حد سے بڑھا دیا۔ میں تو محض ایک بندہ ہوں سو مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہنا۔

عام بندگانِ خاص اور ملائکہ اور دیگر انبیائے کرام کی طرح خیرِ خلق اور سرورِ عالم کا ذکر بھی اسی لفظ "عبد" سے ہوتا ہے۔ معراج جیسے مایۂ صد ناز اور عظمت مآب واقعہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرمایا جاتا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا ......

پاک و برتر ہے وہ خدا جو راتوں رات اپنے بندے کو لے گیا...

فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی طرف جو کچھ وحی کی کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ رسالت کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا۔ (جن - ۱)

اور جب اللہ کا بندہ اس کو پکارنے (قرآن پڑھنے) کے لئے کھڑا ہوا تو وہ اس پر پل پڑے۔

مکذبین قرآن کو چیلنج دیتے اور رسول کریم کی طرف سے تحدی کرتے ہوئے کہا جاتا ہے:-

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۔

اور اگر تم اس چیز (قرآن) کے (منجانب اللہ ہونے کے) بارے میں شک رکھتے ہو جس کو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو پھر اس جیسی ایک ہی سورۃ بنا کر مقابلہ میں لاؤ۔

دین اور عبادت کا ترادف ان آیات و نصوص سے جہاں ایک طرف یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ عبدیتِ مخلوق کے شرف و مجد اور عظمت و سعادت کی معراجِ کمال ہے اور اس کے آگے بلندی کا کوئی مقام باقی نہیں رہ جاتا، وہاں دوسری طرف یہ امر بھی بے نقاب ہو جاتا ہے کہ دین اپنے تمام اجزا کے ساتھ "عبادت" میں سمٹا ہوا ہے۔ سارے انبیاء اللہ کا دین سکھاتے آئے جیسا کہ قرآن میں متعدد مقامات پر تصریح موجود ہے۔ اور پھر ہر نبی نے "فاعبدوہ" کا درس دیا، معلوم ہوا کہ "دین" اور "عبادت" ایک

ہی حقیقت کی دو مختلف تعبیریں ہیں۔ بخاری کی مشہور حدیثِ جبریل اس امر کی پوری وضاحت کر دیتی ہے۔ جبریل علیہ السلام ایک اعرابی کی شکل میں بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے اور آتے ہی صحابۂ کرام کے سامنے رسولِ اکرم صلعم سے اسلام، ایمان اور احسان کے متعلق سوالات کیے کہ اسلام کیا ہے؟ تو رسول اللہ نے جواب دیا "اسلام یہ ہے کہ تم شہادت دو، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، اور یہ کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو رمضان کے روزے رکھو اور بشرط استطاعت حج کرو" پھر پوچھا کہ "ایمان کی کیا تعریف ہے؟" ارشاد ہوا "ایمان نام ہے خدا (کی وحدانیت) پر اس کے فرشتوں پر اس کی نازل کی ہوئی کتابوں پر اس کے بھیجے ہوئے رسولوں پر، مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر اور احوال و واقعاتِ عالم کو خواہ وہ خیر ہوں یا شر نوشتۂ تقدیر کا پابند ہونے پر دل سے یقین لانے اور رکھنے کا" پھر سوال کیا کہ "احسان" کسے کہتے ہیں؟ فرمایا "احسان یہ ہے کہ تم خدا کی عبادت کرو اس طرح کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمھیں دیکھ ہی رہا ہے"۔ جب جبریل علیہ السلام یہ سوال و جواب کر کے چلے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ جبریل تھے جو تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے"۔

دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام چیزوں کو "دین"

فرمایا دراں حالیکہ انہی تمام چیزوں کے مجموعہ کا نام "عبادت" بھی ہے۔

"دین" اور "عبادت" کی لغوی تحقیق آؤ، "دین" اور "عبادت" کے الفاظ پر غور کرکے دیکھیں کہ لغت میں ان کا مفہوم اور مدلول کیا ہے؟

دین کے لغوی معنوی ہیں عاجزانہ سرفگندگی، خضوع اور تذلل، اہل عرب کہتے ہیں "دنتہ" فدان" یعنے میں نے اس کو ذلیل وناچار اور اپنا مطیع ومنقاد بنایا اور وہ ایسا بن گیا۔ "ندین اللہ" وندین للہ" یعنے ہم خدا کی بندگی واطاعت کرتے ہیں اور اپنے کو اس کے سامنے ڈال دیتے ہیں پس اللہ کے دین کا مطلب ہوا اس کی اطاعت بندگی اور اس کے سامنے اظہار تذلل وسرفگندگی۔

عبادت کا لغوی مفہوم بھی اس کے قریب قریب ہے اور اس لفظ کی معنی بھی تذلل اور انقیاد تام کے ہیں، چنانچہ اہل عرب اس راستہ کو جو کثرتِ آمدورفت کی وجہ سے راہ گیروں کے قدموں سے خوب روندا گیا ہو اور بالکل صاف اور ہموار ہو گیا ہو "طریق معبد" کہتے ہیں لیکن اصطلاحِ شریعت میں عبادت کا مفہوم اسی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ خضوع اور تذلل کے ساتھ اس میں محبت کا عنصر بھی شامل ہے، اور عبادت شریعت کی زبان میں اللہ تعالیٰ کے روبرو انتہائی تذلل اور کامل محبت دونوں کے مجموعے کا نام ہے چنانچہ اسی بناء پر لغتِ عرب میں "تیم" لفظ عبد کے معنی میں آتا ہے تتیم محبت کے

آخری درجہ کا نام ہے جس طرح کہ اس کے پہلے درجہ کو "علاقہ" دوسرے کو "صبابتہ" تیسرے کو "غرام" چوتھے کو "عشق" کہتے ہیں پس متیتم وہ شخص ہوا جو اپنے محبوب میں بالکل کھو گیا اور اس کے سامنے بالکل بچھ گیا ہو یعنی اس کا کامل غلام اور معبد ہو متیتم اور تیم کے الفاظ کا عبد کے معنی میں آنا خود گواہی دیتا ہے کہ عبادت کے اندر محبت کا بلکہ عشقِ کامل کا بھی مفہوم موجود ہے پس اگر کوئی عاشق کسی دوسرے کے سامنے جھکتا تو ہے مگر ارادت اور محبت کے بجائے بغض اور کراہت قلبی کے ساتھ جھکتا ہے، یا وہ ایک شخص سے محبت تو کرتا ہے مگر اس کے سامنے فروتنی اور سرفگندگی کا اظہار نہیں کرتا جیسا کہ ایک باپ اپنے بیٹے سے یا ایک دوست اپنے دوست سے محبت رکھتا ہے، تو ایسی حالت میں اس کو عبد یا عابد نہ کہا جائیگا۔

لفظِ "عبادت" کی اس تشریح کو سامنے رکھیئے تو یہ حقیقت خود بخود بے نقاب ہو جاتی ہے کہ شریعت نے جس عبادت الٰہی کا ہمیں حکم دیا اور ہمارا مقصدِ زندگی قرار دیا ہے اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا اگر اس کے اندر ان دونوں چیزوں میں سے صرف ایک ہی چیز ہو اور اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بندہ کے نزدیک کائنات کی ہر شئے سے زیادہ محبوب اور ہر چیز سے زیادہ مکرم و محترم ہو، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کامل محبت اور کامل تعظیم و تکریم کا مستحق صرف اللہ ہی ہے اور ہر وہ

محبت غلط اور فاسد ہے جو غیر اللہ سے کی جائے۔ اگر اللہ کے لئے نہ ہو۔ نیز ہر وہ تعظیم اصلاً باطل اور ناروا جو کسی ماسوا کی کی جائے اور فرمانِ الٰہی کے ماتحت نہ ہو حق تعالیٰ کا کہنا ہے کہ۔

قُلْ اِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (توبہ - ۳)

اے نبی مسلمانوں سے کہدو کہ اگر تمھارے باپ، بیٹے اور بھائی تمھاری بیویاں، تمھارے خاندان، تمھارے وہ مال جن کو تم نے کما رکھا ہے، تمھاری وہ تجارتیں جن کے سرد پڑ جانے کا تمھیں اندیشہ لگا رہتا ہے اور تمھارے وہ مکانات جن کو تم بہت پسند کرتے ہو ــــ اگر یہ تمام چیزیں تمھارے نزدیک اللہ اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو ٹھیرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم سامنے لے آئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ محبت اصلاً خدا ہی کا حق ہے اور نبی کی محبت بھی اُس کی تبعیت میں ہے۔ لیکن بہر حال شرعی طور پر اصل محبت

خدا اور رسول دونوں سے ہونی چاہئے جس طرح اطاعتِ مطلق اور طلبِ رضا دونوں کی ہونی چاہئے۔

وَاللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ۔

اللہ اور رسول اس بات کا زیادہ حق رکھتے ہیں کہ یہ لوگ انھیں خوش رکھیں۔

نیز صاحبِ حکم و امر دونوں ہی ہیں۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ

اور کاش یہ لوگ راضی ہوتے اس چیز پر جس کو اللہ اور رسول نے انھیں دیا تھا۔

لیکن یاد رہے کہ عبادت اور اس کے لوازم مثلاً توکل، اور خوف و رجا وغیرہ کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور ان امور میں اس کا رسول کسی حیثیت سے بھی اس کا شریک نہیں ہے۔ قرآن کا اعلان ہے کہ:-

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ

(آل عمران - ۷)

اے نبیؐ کہدو کہ اے اہلِ کتاب آؤ ایک ایسے کلمہ کی
کی طرف جو ہمارے تمھارے درمیان برابر ہے یعنے یہ کہ
ہم صرف اللہ کی عبادت کریں اور کسی کو اُس کا شریک نہ
ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی خدا کو چھوڑ کر کسی کو اپنا رب
نہ بنائے۔ پھر اگر یہ لوگ تمھاری بات نہ مانیں تو ان سے
کہدو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم (اس امرِ حق کے سامنے سرِ تسلیم
خم کرنے والے) ہیں۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ
وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗۤ
اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝ (توبہ - ۷)

کیا خوب ہوتا اگر وہ لوگ راضی ہو جاتے اس چیز پر جس کو
اللہ اور اس کے رسول نے اُنھیں دیا تھا اور کہتے کہ اللہ
ہمارے لئے کافی ہے وہ اپنے فضل سے ہم کو آئندہ بھی
دے گا اور اس کا رسول۔ ہم تو خدا ہی کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔
دیکھو اس آیت سے دونوں باتیں ثابت ہو گئیں۔ یہ بھی کہ صاحبِ
امر و نہی اللہ بھی ہے اور اس کا رسول بھی جیسا کہ ایک دوسری آیت
میں اس کی تصریح موجود ہے۔

وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا
نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۝ (حشر - ۱)

جو کچھ رسول تمھیں دیں، اسے لے لو، اور جس چیز سے روکیں اُس کو چھوڑ دو۔

اور یہ بھی کہ "حسب" یعنے کفایت کنندہ اور کارسازِ کل اور معتمد علیہ صرف اللہ جلشانہٗ ہے اور اس حقیقت کو ایک سے زائد آیتوں میں بوضاحت بیان کر دیا گیا ہے:-

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ

(آل عمران-۱۰)

وہ جن لوگوں نے کہا کہ مکہ والوں نے تمھارے مقابلہ کے لئے (بڑی جمعیت اور سامان) فراہم کیا ہے، سو اُن سے ڈرو تو (یہ سن کر) ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور اُنھوں نے کہا کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰہُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (انفال-۸)

اے نبی! تمھارے لئے اور تمھارے پیرو کار مسلمانوں کے لئے[1] اللہ کافی ہے۔

---

[1] بعض لوگوں نے "من" کو "اللہ" کے لفظ پر عطف مانا ہے اور ان کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ "اے نبی تمھارے لئے اللہ اور تمھارے مومن متبعین کافی ہیں" لیکن آیت کا مفہوم سمجھنے میں ان لوگوں نے بڑی

أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ۔

کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں۔

عبدیت کی تحقیق اب ہم لفظ "عبد" اور "عبادت" پر تحقیق و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں: "عبد" کے دو معنی ہیں۔ معبدؔ[1] اور عابدؔ[2]۔ معبدؔ یعنے مشیتِ الٰہی کے فیصلوں کا زیرِ فرمان، تابع اور مجبورِ محض غلام جو خدا کے احکامِ قضا کے سامنے طبعی اور فطری طور پر بالکل جھکا ہوا ہو اور اللہ تعالیٰ اس کے احوال و معاملات کو جس طرح چاہتا ہو، بناتا بگاڑتا اور الٹتا رہتا ہو۔

عبدیت کا تکوینی مفہوم اس معنی کے اعتبار سے کائنات عالم کا ایک ایک ذرہ بغیر استثناء کے خدا کا عبد ہے۔ نیکو کار ہوں یا بدکار مومن ہوں یا کافر، متقی ہوں یا فاجر، اہلِ جنت ہوں یا اہلِ نار، سب کے سب یکساں طور پر عبد ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سب کا رب ہے، سب کا مالک اور خالق ہے اور ان میں سے کوئی بھی اس کی مشیت اور قضا و قدر سے یک سرِ مو باہر قدم نہیں رکھ سکتا وہ جو کچھ چاہتا ہے وہی ظہور میں آتا ہے، خواہ اس کے ظہور میں نہ آنے کی کتنی ہی خواہش کیوں نہ کی جائے۔ اسی طرح جو کچھ وہ نہیں چاہتا وہ کبھی صورتِ وجود اختیار نہیں کر سکتا، خواہ اس کی کتنی ہی شدید تمنا

(بقیہ صفحہ گزشتہ) محض غلطی کی جس کی تردید کی بھی ضرورت نہیں۔ قرآن کے مسلمہ کلیات سے یہ بات سراسر خلاف ہے۔

کیوں نہ کی جائے یہی قانونِ فطرت ہے جو اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّإِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (آلِ عمران ۔ ۹)

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین ڈھونڈھتے ہیں حالانکہ جو کچھ اور جو کوئی بھی آسمان اور زمین میں ہے چار و نا چار اس کے سامنے سرفگندہ ہے اور اسی کے حضور یہ سب لوٹائے جائیں گے۔

پس اللہ تعالیٰ ہی رب العالمین ہے، وہی سب کا پروردگار ہے سب کا خالق ہے۔ سب کا رازق ہے سب کا زندگی بخشنے والا سب کا مارنے والا، سب کے دلوں کو پھیرنے والا اور سب کے عواقب و احوال کے اندر حسبِ منشا، تصرف کرنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی اُس کا رب، خالق اور مالک نہیں خواہ کوئی اس امر بدیہی کا اعتراف کرے یا نہ کرے اور اس حقیقتِ تاباں سے واقف ہو یا نہ ہو۔

عبدیت کی اِس منزل میں تو اہلِ ایمان اور اہلِ کُفر دونوں ہی ساتھ ساتھ ہوتے ہیں، لیکن اب اس سے آگے چل کر دونوں کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں، اور دونوں کے درمیان ایک خطِ امتیاز

کھنچ جاتا ہے۔ اہلِ ایمان تو ان حقائق کا علم بھی رکھتے ہیں اور دل کی گہرائیوں میں ان پر اذعان اور یقین بھی رکھتے ہیں لیکن جو ایمان کی روشنی سے محروم ہیں وہ یا تو ان حقائق کا جیسا کہ چاہیئے علم نہیں رکھتے یا پھر علم تو نہیں رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود انکار کر دیتے ہیں، پروردگارِ حقیقی کے خلاف اپنی کبریائی کا علم بلند کر دیتے ہیں اور اس کے سامنے جھکنے اور سرِ عجز و نیاز خم کرنے کے بجائے استکبار کی روش پر جم جاتے ہیں۔ گو اندر سے ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ نے ہی انھیں پیدا کیا ہے اور وہی انھیں رزق بھی دیتا ہے یہ دونوں ہی قسم کے منکرینِ حق ایمان و کفر کے لحاظ سے ایک ہی پوزیشن رکھتے ہیں اور دوسری قسم کے باغیانِ حق کا علم و اعتراف ان کی حیثیتِ ایمانی پر کوئی اثر نہیں ڈالتا کیونکہ انکار اور سرکشی کے ساتھ معرفتِ حق، علامتِ ایمان اور موجبِ نجات نہیں بلکہ اور زیادہ باعثِ عذاب ہے۔ فرعون اور فرعونیوں کے حق میں قرآن فرماتا ہے:۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ؟ (نمل - ۱)

باوجود اس کے کہ ان کے قلوب خدا کی نشانیوں کی صداقت کا یقین رکھتے تھے لیکن انھوں نے ظلم اور کبر کی بناء پر انکار کر دیا

سو دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیسا انجام ہوا؟

اہل کتاب کے متعلق فرمایا:۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْھُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝

(البقرہ - ۱۷)

جن لوگوں کو (پہلے) ہم نے کتاب دی تھی وہ اس (قرآن یا صاحب قرآن) کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے امر حق کو چھپاتا ہے۔

فَاِنَّھُمْ لَا یُکَذِّبُوْنَکَ وَلٰکِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ ۝

دراصل یہ لوگ تمھیں نہیں جھٹلاتے (بلکہ دل میں تمھیں سچا سمجھتے ہیں) لیکن یہ ظالم خدا کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

بہرحال بندہ کا اللہ تعالیٰ کے متعلق صرف اس قدر علم و اعتراف کہ وہی اس کا پروردگار اور خالق ہے اور وہ بہرحال میں اس کا محتاج اور نیازمند ہے اپنی صرف اس عبودیت کا اقرار ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے ہے ایسا بندہ اپنے رب حقیقی کے سامنے بوقت ضرورت دستِ سوال بھی پھیلایا کرتا ہے۔ اس کے سامنے گڑگڑاتا

بھی ہے اور اس پر توکل بھی رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود اُس کے احکام کی اطاعت میں ثابت قدم نہیں نکلتا۔ وہ کبھی ان کو مانتا ہے کبھی نہیں مانتا، کبھی خدا کے روبرو جھکتا ہے تو کبھی شیاطین و اصنام کے سامنے سجدہ ریز نظر آتا ہے۔ سو اس قسم کی عبودیت ــــ یعنے اللہ تعالیٰ کی محض صفتِ ربوبیت کے فہم و یقین ــــ سے کسی شخص کے با ایمان ہونے کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، اور نہ اس یقین سے اہلِ جنّت اور اہلِ نار کے درمیان کوئی تفریق ہو سکتی ہے۔ اس قسم کا ایمان اپنے وجود و عدم کے لحاظ سے یکساں ہے قرآن میں ہے:۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُوْنَ ۝

اور ان میں سے بیشتر تو اس طرح خدا پر ایمان رکھتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اس کی خدائی میں شریک ٹھیراتے ہیں۔

مشرکین کو بھی اس سے انکار نہ تھا کہ اللہ ہی سب کا خالق اور رازق ہے اور نہ قرآن حکیم نے کبھی ان پر یہ الزام رکھا کہ وہ خدا کی خالقیت اور رازقیت کو کیوں نہیں تسلیم کرتے۔ اس کا ان پر الزام صرف یہ تھا کہ اس علم اور اقرار کے باوجود کہ خدا ہی سب کو وجود بخشتا اور سامانِ زیست بہم پہنچاتا ہے ــــ دوسروں کو کیوں اس کی معبودیت میں حصہ دار بناتے ہیں۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهَ ۔ (عنکبوت)

اور اگر تم اُن سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیئے اور سورج اور چاند کس نے مسخّر کیئے تو جواب دیں گے اللہ نے۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ، قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۔ (مومنون - ۵)

ان سے کہو (ذرا بتاؤ تو سہی) یہ زمین اور اس کے بسنے والے کس کے ہیں؟ اگر تم جانتے ہو۔ جواب دیں گے اللہ کے۔ کہو۔ تو کیا پھر بھی تم کو ہوش نہیں آتا؟ پوچھو کہ ساتوں آسمان اور بزرگی والے تخت کا رب کون ہے؟ کہیں گے یہ سب اللہ ہی کی ملکیت ہیں۔ کہو تو کیا پھر بھی تم نہیں ڈرتے۔ پھر دریافت کرو کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر شئے کی بادشاہت اور

حکمرانی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے مگر اس کے مقابلہ میں کہیں بھی
پناہ نہیں مل سکتی۔ (بتاؤ) اگر تم جانتے ہو! جواب دیں گے اللہ
ہی کی (ساری کائنات کی حکومت ہے)۔ کہو تو پھر کہاں سے
تم پر جادو آپڑا ہے (کہ تمھاری عقل یوں ماری گئی)۔

اور یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکار مشکل ہی کوئی سوجھ بوجھ رکھنے
والا انسان کرسکتا ہے۔ ہر شخص کو ایک ادنیٰ تامل اور تفکر اس
حقیقت تکوینی کا مشاہدہ کرا سکتا ہے۔ چنانچہ خدا کے مُسلم اور
فرمانبردار بندوں ہی کی یہ کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اُس کے
باغی اور نافرمان بندے بھی اس حقیقت کو اسی طرح مانتے ہیں۔
جیسا کہ اہلِ ایمان حتیٰ کہ ابلیس لعین بھی اپنی تمام ڈھٹائیوں کے
باوجود اس سے انکار کی جرأت نہیں کرسکا اور اپنی سزائے ملعونیت
سننے کے بعد بھی اس کے منہ سے سب سے پہلے یہی نکلا کہ:۔

رَبِّ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (حجر-۳)

اے رب! تو مجھے اس دن تک کے لئے مہلت دے جبکہ
مردے اٹھائے جائیں گے۔

رَبِّ بِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَھُمْ
فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ
(حجر-۳)

اے رب! جس طرح تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں بھی یقیناً

اُن انسانوں کو زمین میں سبز باغ دکھاؤں گا اور ان سب کو گمراہ کروں گا۔

فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ۔

قسم ہے تیرے عزّ و جلال کی میں ضرور ان سب کو جادۂ حق سے پھیروں گا۔

یہ اور اِس طرح کی بے شمار آیتیں ہیں جن میں وہ اس بات کا علانیہ اقرار کرتا ہے کہ اللہ ہی اس کا اور سب کا پروردگار اور خالق ہے نہ کہ کوئی اور۔ اسی طرح اہلِ جہنم بھی اس اعتراف میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں گے وہ اس امر کا اقرار کریں گے کہ:۔

رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ قَالَ أَلَيْسَ هَٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا

(انعام - ۳)

اے ہمارے رب! ہم پر ہماری بدبختی سوار ہو گئی تھی اور ہم گم کردہ راہ لوگ تھے۔ کاش کہ تم ان لوگوں کو اس وقت دیکھتے جب کہ اپنے رب کے حضور کھڑے کیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کیا یہ حق نہیں ہے؟ تو جواب دیں گے کیوں نہیں، قسم ہے ہمارے رب کی (یہ سب حق ہے)۔

پس جو شخص اسی حقیقت تکوینی کی حد تک پہنچ کر رُک جاتا ہے اور اس

عبدیت سے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے ہے، آگے قدم بڑھا کر حقیقتِ تشریعی کی حدود میں داخل نہیں ہوتا اور اس عبدیت کا قائل اور حامل نہیں بنتا جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی الٰہیت، معبودیت اور اس کی اور اس کے پیغمبروں کی اطاعت سے ہے وہ کسی طرح بھی ابلیس اور اہلِ جہنم کے مقابلہ میں کوئی امتیاز نہیں رکھتا، دراصل وہ انہی کی جنس اور زمرہ میں شامل ہے اور اگر اس کے باوجود اپنے تئیں یہ زعم بھی رکھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان "بندگانِ خاص" اور "اولیاء مقربین" اور "پہنچے ہوئے عارفین کاملین" میں سے ہے جن سے تکلیف شرعی ساقط ہوگئی ہے تو وہ کافروں اور ملحدوں سے بھی بدتر اور گمراہ تر انسان ہے۔ اسی طرح جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ حضرت خضر یا کوئی اور احکامِ شرعی کا مکلف نہیں اس لئے کہ اس کو ارادۂ الٰہی اور اسرار تکوینی کا مشاہدہ حاصل ہے تو اس کا یہ گمان اور قول منکرینِ خدا کے اقوال اور اوہام اور اباطیل سے بھی زیادہ بیہودہ ہے۔

عبد اور عبدیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے جس کی ابتک اوپر کی سطروں میں توضیح ہوئی اور جیسا کہ یہ بھی بیان ہو چکا کہ عبدیت کے اس مفہوم کے لحاظ سے ہر شخص خدا کا عبد ہے۔ مومن بھی، حتّٰی کہ جس طرح ایک نبی اسی طرح ایک شیطان رجیم بھی، اور یہ عبدیت، نجات و کامرانی آخرت کے لئے ذرا بھی مفید نہیں جب تک کہ انسان اس سے آگے بڑھ کر عبدیت کے دوسرے مفہوم کے لحاظ سے عبد نہ بن جائے۔

عبدیت کا دینی مفہوم "عبد" کا دوسرا مفہوم "عابد" ہے، یعنی بندہ صرف اللہ ہی کی عبادت کرے، کسی دوسرے کے سامنے اپنی پیشانی نہ جھکائے، اس کے اور اس کے رسولوں کے احکام کی اطاعت کرے، اس کے صالح اور متقی بندوں سے رابطۂ محبت رکھے اور اس کے نافرمان اور باغی بندوں سے ترکِ تعلق کرلے۔ اس دوسرے معنی کے لحاظ سے ایسا بندہ عبدیت سے خارج ہے جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت تو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کی عبادت اور اطاعت نہیں کرتا یا اس کے ساتھ کسی دوسرے "اِلٰہ" کی بھی عبادت کرتا ہے۔ کیونکہ کسی ذات کو اِلٰہ تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا قلب انتہائی محبت اور رغبت اور پوری تعظیم و تکریم اور خوف و رجا، صبر و شکر اور انابت و توکل کے گہرے جذبات کے ساتھ اس طرف مائل ہو، پس جب یہ بندہ اللہ کے ماسوا بھی کسی کو معبود اور اِلٰہ بناتا ہے تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے جذباتِ عبودیت اور احساسات شوق و محبت کو تقسیم کر دیتا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسا شخص عموماً اپنی ساری متاعِ نیاز غیر اللہ ہی کے حضور ڈال دیا کرتا ہے۔

عبدیت اور عبادت کا یہ پہلو اللہ تعالیٰ کی الوہیت سے تعلق رکھتا ہے، یعنی اُس کی الوہیت کا مُقتضا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ توحید کا عنوان ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ (اللہ کے سوا کوئی الٰہ اور معبود نہیں)

یہی وہ عبادت ہے جو خدا کی نگاہ میں محبوب اور ماجور ہے، اسی عبدیت کا وہ اپنے بندوں سے مطالبہ کرتا ہے، اسی عبودیت کو وہ اپنے صالح اور برگزیدہ بندوں کی صفتِ امتیاز اور وجہ بزرگی قرار دیتا ہے اور اسی کی تبلیغ و تذکیر کے لئے وہ اپنے پیغمبروں کو دنیا میں بھیجتا رہا ہے۔ اس کے بالکل برعکس اور بالمقابل عبد اور عبدیت کا پہلا مفہوم ایک ایسی چیز ہے جس کا رضائے الٰہی سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ جیسا کہ اوپر گزر چکا، اس میں کافر اور مومن برابر کے شریک ہیں، ایک کافر بھی ان معنوں میں، ویسا ہی عبد ہے جیسا کہ ایک مومن۔

حقائق تشریعی و حقائق تکوینی میں فرق نہ کرنے کے نتائج۔

"عبادت" کے ان دونوں مفہوموں میں جو فرقِ عظیم ہے اُس کو ذہن نشین کر لینے کے بعد وہ فرق بآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے جو حقائقِ تشریعی اور حقائقِ تکوینی کے درمیان اور ان کے علم و اعتراف کے درمیان ہے حقائقِ تشریعی یا دینی تو وہ حقیقتیں ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی اطاعت، عبادت، اور شریعت سے ہے جو اس کی رضا کا ذریعہ ہیں اور جن کے ماننے والوں کو وہ اپنی دوستی اور ولایت کی سندِ افتخار عنایت کرتا ہے۔ اور حقائقِ تکوینی وہ حقیقتیں ہیں جن کا تعلق اولیاء الشیطان سے بھی اسی قدر ہے جس قدر اولیاء الرحمٰن سے ہے یعنے اگر ایک شخص محض انہی حقائق کے تسلیم کر لینے پر اکتفاء کرتا ہے اور اُن سے آگے

بڑھ کر حقائقِ تشریعی کا علم واذعان بھی عملاً اپنے اندر نہیں پیدا کرلیتا، تو وہ پیروانِ ابلیس کے زمرہ میں شامل ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص حقائقِ تکوینی ہی کے تسلیم کر لینے اور انھیں کے مطابق اپنی زندگی کا نظام چلانے پر اکتفا تو نہیں کرتا بلکہ حقائقِ دینی کا بھی اس کے دل ودماغ میں دخل ہے مگر پوری طرح نہیں ہے بلکہ بعض امور میں تو وہ ان حقائق کی روشنی قبول کرتا ہے اور کچھ دوسرے امور میں ان کی طرف سے آنکھیں پھیر لیتا ہے، تو ایسا شخص ایک نامکمل مومن ہے اور خدا کا ناقص پرستار۔ اس کے ایمان میں اسی قدر کمی اور نقص ہے جس قدر کہ وہ حقائقِ دینیہ کے اتباع سے گریز کرتا اور علمی یا عملی طور پر ان کا انکار کرتا ہے۔

یہ ایک اہم تشریعی نکتہ اور بڑا ہی نازک مقام ہے جہاں کتنوں ہی کے قدم راہِ راست سے منحرف ہو گئے اور حق کی شاہِ راہ سے دور جا پڑے خصوصاً اہلِ سلوک کو اکثر اس مقام پر سخت اشتباہات سے دوچار ہونا پڑا اور ایسے بے شمار اکابر شیوخ طریقت نے یہاں ٹھوکریں کھائی ہیں جن کو تحقیق حق اور توحید و معرفت الٰہی کا راز داں کہا جاتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

"بہت سے لوگ ہیں کہ جب وہ قضا و قدر کے پاس پہنچے (یعنی انھیں ارادۂ الٰہی کا مشاہدہ نصیب ہوا تو وہیں ٹھیر گئے لیکن

میرا حال یہ نہیں ہے بلکہ میں وہاں پہنچا تو میرے روبرو اس میں ایک کھڑکی کھلی اور میں نے قدر و ارادۂ الٰہی سے ___ حق کے ساتھ اور حق کے لئے ___ جنگ کی ___ مرد وہ ہے جو قدر کا مقابلہ کرتا ہے، نہ کہ وہ جو اس کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے"۔

شیخ ممدوح کا یہ فرمانا عین مدعائے شریعت ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں امر فرمایا ہے اور جس کی اس کے رسول نے ہم کو تعلیم دی ہے۔ لیکن بہتیرے یہاں پہنچ کر بھٹک گئے اور سر رشتۂ حق ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ اور یہ اس طرح پر کہ جب کبھی وہ سلوک کی منزلیں طے کرتے ہوئے قضائے الٰہی کے قریب جا پہنچتے ہیں اور وہاں ان گناہوں اور معصیتوں کا ___ حتیٰ کہ شرک اور کفر جیسی معصیتوں کا ___ مشاہدہ کرتے ہیں جو ان پر یا دوسروں پر مقدر ہو چکی ہوتی ہیں اور انھیں نظر آتا ہے کہ ان معصیتوں کا وقوع اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قضاء کے مطابق ہونے والا ہے، یعنی وہ اس کے احکامِ ربوبیت اور مقتضائے مشیت کے تحت (نہ کہ اس کی رضا کے اندر) داخل ہیں تو ان کی عقل و فہم پر یہ خیال غلبہ پالیتا ہے کہ بس اب یہ جو کچھ قضائے خداوندی میں طے ہو چکا ہے، اُس کے سامنے سر تسلیم و نیاز خم کر دینا بلکہ اس پر راضی ہو جانا ہی دین و شریعت اور عبادت و طریقت ہے۔ لیکن ذرا غور تو فرمائیے کتنا خطرناک خیال ہے جو اُن مشرکین کے خیالات سے کسی طرح بھی مختلف نہیں جو کہا کرتے تھے۔

لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۝ (انعام - ۱۸)

اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم، نہ ہی ہمارے باپ دادا شرک کرتے اور نہ کسی چیز کو حرام ٹھیراتے۔

لَوْ شَاءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ (زخرف - ۲)

اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان بتوں کو نہ پوجتے۔

أَنُطْعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللّٰهُ أَطْعَمَهُ (یٰسین ۳)

کیا ہم انھیں کھلائیں جن کو اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟

لیکن اگر ان لوگوں کو ہدایت کی روشنی نصیب ہوتی تو انھیں معلوم ہوتا کہ ایمان بالقدر اور تسلیم و رضا کا وہ مقصد ہرگز نہیں ہے جو خیرہ نگاہی کے باعث انھوں نے سمجھ رکھا ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم پر جو مصیبت بھی پڑے ہم اُس پر صبر کریں، اور یہ یقین کر کے کہ یہ خدا ہی کی طرف سے ہے جس کا ہم پر نازل ہونا ناگزیر تھا اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے جائیں جیسا کہ قرآن میں ہے۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهُ ۝

جو مصیبت بھی کسی کو پہنچی وہ اللہ ہی کے حکم سے پہنچی اور جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو راہِ راست

سمجھا دیتا ہے۔

بعض علمائے سلف کی تفسیر کے مطابق "مَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ" سے مراد وہ شخص ہے جو مصائب دنیا میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے اندر یہ یقین بیدار ہو جاتا ہے کہ یہ سارے آزار خدا ہی کی طرف سے ہیں پھر ان پر جزع فزع کرنے کے بجائے اس کے قلب پر صبر و رضا کا سکون چھا جاتا ہے۔ دوسری آیت میں فرمایا جاتا ہے کہ:-

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ

(حدید - ۳)

زمین میں اور خود تمہارے اپنے اوپر جو مصیبت بھی نازل ہوتی ہے وہ قبل اس سے کہ ہم اس کو عالم وجود میں لے آئیں ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ بے شک کہ یہ بات اللہ کے لئے آسان ہے (اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو) تاکہ کسی چیز کے ہاتھ نہ آنے کا نہ تمہیں افسوس ہو اور نہ کسی چیز کے ملنے کی از حد خوشی۔

صحیح بخاری اور مسلم دونوں کی روایت ہے کہ "حضرت آدم اور موسیٰ

نے فرمایا کہ آپ وہی آدم ہیں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا اور آپ کے پُتلے میں اپنی روح پھونکی، فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اور تمام چیزوں کے "اسماء" کا آپ کو علم بخشا پھر آپ نے ہمیں اور خود اپنے کو جنت کی نعمتوں سے کیوں نکال باہر کیا؟" حضرت آدم نے جواب دیا " آپ وہی موسیٰ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام سے نوازا اور اپنے پیغام کا حامل اور مبلغ بنایا اور شرفِ نبوت عطا کیا تو آپ کو معلوم ہے کہ یہ بات میرے حق میں میری آفرینش سے پہلے ہی لکھی جا چکی تھی (یا نہیں)؟ حضرت موسیٰ نے فرمایا ہاں (یہ تو صحیح ہے)؟"

مباحثہ کی یہ روداد بیان کر چکنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ " اس مباحثہ میں حضرت آدم نے حضرت موسیٰ کو قائل کر دیا۔"

دیکھو، حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اپنے کو بے قصور ٹھیرانے کے لئے قضا و قدر کا نام نہیں لیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قضا و قدر سے استدلال کرنا جاہل اور معصیت پرست کا کام ہے نہ کہ کسی مومن مسلم کا اس لئے کہ اگر یہ چیز کسی کے گناہ کے لئے عذر ہو سکتی ہے تو ہر کافر اور عاد و ثمود جیسی گمراہ اور مغضوب قوم حتیٰ کہ ابلیس تک کو اس بناء پر معذور سمجھنا چاہیئے کہ انھوں نے جو کچھ کیا، مشیتِ الٰہی کے مطابق کیا۔

پھر حضرت موسیٰ کے اسلوبِ اعتراض پر بھی غور کرو کہ انھوں نے
حضرت آدم کو ان کے ارتکابِ گناہ پر کوئی ملامت نہیں کی کیونکہ
ان کا یہ گناہ بارگاہِ الٰہی سے بخشا جا چکا تھا اور حضرت آدم مغفرت
ہدایت اور نبوت کے سہ گانہ انعامات سے سرفراز ہو چکے تھے۔
بلکہ ان کو ملامت اس مصیبت کی بناء پر کی جو ان کی لغزش کی وجہ
سے تمام بنی نوعِ انسان پر نازل ہوئی اور انھوں نے حضرت آدم
سے صرف یہ کہا کہ "آپ نے ہمیں جنت سے کیوں نکالا" جس کا
جواب بھی حضرت آدم نے وہی دیا جو دینا چاہیے تھا کہ "یہ بات تو
میرے آب و گل میں آنے سے پہلے ہی طے ہو چکی تھی" یعنی یہ لغزش
اور اس لغزش کی یہ سزا دونوں ہی نوشتۂ ازل میں مقدر تھیں
اور جو مصائب مقدر ہو چکے ہوں انھیں ان کے واقع ہو جانے پر
صبر و تسلیم کے جذبات کے ساتھ جھیل لے جانا ضروری ہے کہ اللہ جلشانہ
کو اپنا رب ماننے کا یہی معیار ہے اسی کا نام تسلیم و رضا ہے اور یہی
کمال ایمان کا مقتضا ہے۔ قرآن مجید نے بار بار اسی چیز کا مطالبہ
کیا ہے:۔

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ

(مومن - ۶)

پس (مصائب پر) صبر کرو (اور یقین رکھو کہ) خدا کا وعدہ
سچا ہے اور اپنے گناہ کی معافی مانگو۔

وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ۔

(آل عمران - ۱۲)

اور اگر تم صبر سے کام لو گے اور خدا سے ڈرتے رہو گے تو ان (اعداءِ دین) کی چالیں تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی۔

وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ۔

اور اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک یہ ہمت کے کام ہیں

حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔

(یوسف - ۱۰)

اس میں شک نہیں کہ جو خدا سے ڈرتا ہے اور صبر پر کاربند رہتا ہے (اس کے لئے کامیابی ہے) کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

غرض نزولِ مصائب کے وقت ایک مومن کا فرض یہی ہے کہ وہ صبر اور تسلیم کا شیوہ اختیار کرے۔ اسی کا نام ایمان بالقدر اور تسلیم و رضا ہے۔ اس کے بمقابل معاصی کے بارے میں اس کا فرض یہ ہے کہ ان پر صبر کرنے اور خوشی کے ساتھ کرتے رہنے کے بجائے ان سے پوری نفرت کے ساتھ دور بھاگے، ان کے سامنے سپر انداز ہونے کے بجائے ان سے برسرِ پیکار رہے اگر کبھی دامن ان سے آلودہ ہو جائے

تو خدا کے سامنے توبہ و استغفار کے آنسوؤں سے اُسے پاک کرنے کی کوشش کرے۔ اسی طرح اگر وہ اپنے کو نہیں بلکہ دوسروں کو خدا کی نافرمانیوں میں مبتلا پائے تو اس وقت اس کا فرض یہ ہے کہ اپنی وسعت اور طاقت بھر انھیں اُن سے روکنے کے لئے کمربستہ ہو جائے۔ جہاں کہیں بھی بُرائی نظر آئے، اُسے مٹانے کی جدوجہد کرے اور اس کے پشت پناہوں — یعنی کفار اور منافقین — سے خدا کے لئے جنگ کرے۔ نیکی اور معروف کو محبت کی نگاہ سے دیکھے اور اس کی تبلیغ و اشاعت میں منہمک رہے۔ اللہ کے دوستوں کو دوست رکھے اور اس کے دشمنوں کو دشمن اللہ ہی کے لئے محبت کرے اور اللہ ہی کے لئے دشمنی اور اس موقع پر نسل و خاندان اور قوم و وطن کے تمام رشتوں کو فراموش کر دے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْھِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ کَفَرُوْا بِمَا جَآءَکُمْ مِّنَ الْحَقِّ یُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِیَّاکُمْ.....

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِھِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کَفَرْنَا

بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ۔ (ممتحنہ-۱)

اے ایمان لانے والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ تم ان کو محبت کا پیغام بھیجتے ہو حالانکہ وہ اس حق کا کھلم کھلا انکار کر چکے ہیں جو تمھارے پاس آیا ہے اور رسول کو، نیز تم سب کو، تمھارے اپنے گھربار سے نکال دیتے ہیں...... تمھارے لئے ابراہیم اور ان کے رفقا (کے سوانح حیات) میں ایک عمدہ نمونۂ عمل موجود ہے۔ یاد کرو اس وقت کو جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم سے اور تمھارے معبودوں سے، جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو، ہم بری اور بے تعلق ہیں، ہم تمھارا (یعنے تمھارے مسلک کا) انکار کرتے ہیں ہمارے تمھارے درمیان ہمیشہ کے لئے دشمنی اور بغض پیدا ہو چکا ہے یہاں تک کہ تم تنہا اللہ ہی پر ایمان لاؤ۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ـــــ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ

بِرُوحٍ مِّنْہُ ؕ (مجادلہ - ۳)

تم کسی قوم کو جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتی ہو ایسا نہ پاؤ گے کہ وہ ان لوگوں سے رشتۂ مودّت رکھتی ہو جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھتے ہوں، خواہ وہ ان کے اپنے ہی باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان والے کیوں نہ ہوں یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان پیوست کر دیا ہے اور اپنی "روح" سے ان کی تائید اور مدد کر رکھی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر کفر و نفاق کی معصیتوں میں گرفتار رہنے والوں کے لئے قضا و قدر کا عذر واقعی کوئی عذر ہوتا تو پھر اُن سے اتنی شدید نفرت اور عداوت رکھنے کا حکم کیوں ہوتا اور اگر ایمان بالقدر کا مطلب یہ ہوتا کہ جو بُرائیاں بھی عالمِ ظہور میں آتی ہیں وہ مشیتِ الٰہی کے بموجب بہر حال ظہور پذیر ہونے والی ہیں اس لئے ان کی مدافعت اور مقاومت کے بجائے ان کا خیر مقدم ہی کرنا چاہیئے تو پھر اہلِ ایمان اور اہلِ کفر اہلِ تقویٰ اور اہلِ فجور سب کو یکساں ہونا چاہیئے تھا۔ حالانکہ قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ :-

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ ۔

کیا ہم ایمان لانے اور اعمالِ صالحہ کرنے والوں کو زمین

ہیں فساد برپا رکھنے والوں کے برابر کر دیں گے یا متقیوں کو

بدکاروں کے مساوی کر دیں گے ؟

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ

اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاۗءَ مَا یَحْكُمُوْنَ

تو کیا ہم اطاعت گزاروں کو مجرموں نافرمانوں کی طرح

کر دیں گے ؟ کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہ برائیاں کمائی ہیں

یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم انھیں ان کے برابر کر دیں گے جو صاحب ایمان

ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کئے ہیں ؟ ان کا مرنا اور جینا دونوں

یکساں ہیں ؟

اس طرح کی ایک دو نہیں بلکہ بے شمار آیات قرآن مجید میں موجود ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ حق اور اہلِ باطل، اہلِ اطاعت اور اہلِ معصیت اہلِ ہدایت اور اہلِ ضلالت، اہلِ تقویٰ اور اہلِ فجور کے درمیان انتہائی تفریق کی اور ان دونوں گروہوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھا ہے لیکن جس شخص کی نگاہ صرف حقائقِ تکوینی تک پہنچتی ہے اور حقائقِ تشریعی کی معرفت تک اس کی رسائی نہیں ہوتی وہ ان دونوں مقابل گروہوں اور ان کی متضاد صفتوں کے مابین کوئی فرق نہیں کرتا اور دونوں کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کرتا ہے - حد

یہ ہے کہ وہ بتوں کو اللہ تعالیٰ کا ہم پلہ قرار دے دیتا ہے جیسا کہ
قیامت کے دن ایسے لوگ خود ہی اپنی اس نادانی کا حیرت کے
ساتھ اظہار کریں گے:

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ
بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ (شعرا - ۵)

قسم اللہ کی یقیناً ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ جب کہ ہم تمہیں
(تم بتوں کو) پروردگارِ کائنات کا ہم پلّہ قرار دیتے تھے“

یہی نہیں، بلکہ اس جاہلانہ منطق نے بہتوں کو جہل و ضلالت کی
اس آخری سرحد پر پہنچا دیا ہے جس کے بعد گمراہی کی کوئی منزل باقی
نہیں رہ جاتی۔ اِن لوگوں نے کائنات کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق
کو خالقِ کائنات کا مساوی ٹھیرا دیا اور ہر موجود کو اس اطاعت اور
عبادت کا مستحق بنا دیا جو صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کا حق تھا
اور یہ اس طرح پر کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ ہی ساری موجودات
کا وجود ہے۔ یعنی وجود کائنات اور ذاتِ الٰہی دونوں ایک ہی
حقیقت کے مظہر ہیں اور ہم جسے اللہ کہتے ہیں وہ مخلوقات کے
وجود سے الگ اور ماسوا کوئی چیز نہیں۔ العیاذ باللہ۔ اس کے بعد
کفر اور الحاد کا اور کونسا مقام باقی رہ جاتا ہے؟

گویا اس خالص کافرانہ نظریہ کے قائلین منطقی طور پر ان دونوں
معنوں میں سے کسی معنی میں بھی اپنی عبودیت کا اعتراف نہیں کرتے

جن کی توضیح اور تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ کیونکہ اس نظریہ کی بناء پر تو وہ خود اپنے ہی کو خدا کہتے نظر آتے ہیں، جیسا کہ بہت سے ملحدین نے صراحتاً اس امر کا دعویٰ کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ ہمیں عابد بھی ہیں اور ہمیں معبود بھی۔ حالانکہ یہ قول نہ تو حقائق دینی ہی کے اعتراف و مشاہدہ پر مبنی ہو سکتا ہے، نہ ہی حقائق تکوینی پر، بلکہ کھلا ہوا جہل اور اندھا پن ہے۔ نصاریٰ کو خدا نے کافر ٹھیرایا صرف اس بناء پر کہ وہ ایک انسان ــــ حضرت مسیح علیہ السلام ــــ کے متعلق حلول اور اتحاد کا عقیدہ رکھتے تھے، پھر ان لوگوں کے کفر صریح کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔ جو کائنات کے ایک ایک ذرے کے بارے میں یہی اعتقاد رکھتے ہیں۔

ان کے مقابل ان لوگوں کی راہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور جن کے پاس خدا کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اُن کا علم اور یقین یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ ہر شئے کا رب، ہر چیز کا مالک اور ہر موجود کا خالق ہے۔ ایسا خالق جو تمام مخلوقات سے بالکل جداگانہ اور مبائن حقیقت رکھتا ہے وہ نہ تو کسی شئے میں حلول کرتا ہے، نہ کسی چیز سے متحد ہوتا ہے اور نہ اس کا وجود اور کائنات کا وجود ایک ہے ــــ اس نے اپنی اور اپنے پیغمبروں کی کامل اطاعت کا حکم دیا اور ہر طرح کی نافرمانی سے منع کیا ہے۔ وہ فساد کو سخت ناپسند کرتا ہے اپنے بندوں کو کفر و شرک کرتے دیکھ کر اُس کے

غضب کی انتہا نہیں رہتی۔ مخلوق کے لیئے ضروری ہے کہ اس کی عبادت میں ہردم معروف رہے، اس کے احکام بجالاتا رہے اور اُس کے لیئے اسی سے توفیق بھی مانگے جیساکہ قرآنِ مجید سکھاتا ہے :۔

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (فاتحہ)

(اے اللہ) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے توفیق اور مدد مانگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں سے منجملہ دیگر فرائض کے ایک فرض یہ بھی ہے کہ خدا کے بندے اپنے مقدور بھر امر بالمعروف کریں، منکر کا سدِّباب کریں اور خدا کی راہ میں کفّار اور منافقین سے جہاد کریں۔

پھر اس علم اور یقین کے بعد وہ عملی طور پر میدان میں اتر آتے ہیں اور اللہ کے دین کو سطحِ ارض پر رائج کرنے کے لیئے اپنی ساری قوتیں صلاحیتیں اور کوششیں صرف کردیتے ہیں اور اس راہ میں وہ اللہ ہی سے نصرت اور تائید بھی مانگتے ہیں نہ کہ قضا و قدر کے نام پر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

یہ طلبِ اِعانت اور توفیق طلبی ان مکروہات کے لیئے تثبیتِ قلب کا کام دیتی ہے جو انھیں اس راہ میں پیش آتے ہیں اور ان مکروہات کا مقابلہ کرنے کی توانائی بخشتی ہے جو آئندہ پیش آسکتے ہیں مثلاً انسان کھانا کھاتا ہے تاکہ وہ اس خوراک سے اپنی موجودہ

بھوک کا ازالہ کرے اور آئندہ کے لئے اپنے جسم کو وہ قوت بہم پہنچائے جو مستقل اشتہا کا دفاع اور مقابلہ کرسکے۔ وہ ایسا کبھی نہیں کرتا۔ کہ تقدیر کے نام پر کھانا پینا چھوڑ دے۔ یہی اصول ہے جو ہمیں اس حدیث سے ملتا ہے کہ صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا وہ دوائیں جن سے ہم اپنا علاج کرتے ہیں اور وہ تعویذ گنڈے جن سے ہم جھاڑ پھونک کرتے ہیں اور اسی طرح کی تمام احتیاطیں اور تدبیریں جن کو ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں برتتے ہیں۔ تقدیر الٰہی کو بدل سکتی ہیں؟ آنحضرت نے ارشاد فرمایا کہ هِيَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ یہ سب چیزیں بھی تقدیر ہی کے ماتحت ہوتی ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "دعا اور بلا زمین اور آسمان کے درمیان دوچار ہوتی ہیں اور آپس میں گتھم گتھا ہوجایا کرتی ہیں"۔

یہ ہے ان لوگوں کے علم و اعتقاد اور سعی و عمل کا حال جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی عبادت و بندگی کرتے ہیں اور یہ تمام چیزیں جن کا اوپر ذکر ہوا سب کی سب عبادت میں داخل ہیں۔

قائلینِ جبر کی گمراہیاں جو لوگ حقائقِ تکوینی کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس مشاہدہ کو حقائقِ دینی اور احکامِ شرعی کے اتباع سے مانع سمجھتے ہیں، یعنی ارادۂ الٰہی کے علم و مشاہدہ کو تکلیفِ شرعی کے ساقط ہوجانے کا موجب ٹھیراتے ہیں، وہ ضلالت کے مختلف مراتب پر ہیں۔

(۱) ان میں جو غالی قسم کے لوگ ہیں اُن کے نزدیک تو یہ اصول

بالکل عام ہے اور وہ ہر اس امر پر قضا و قدر کا نام لینے لگتے ہیں
جو ان سے خلافِ شرع سرزد ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ اصول اور
قول یہود و نصاریٰ کے اقوالِ ضلالت سے بھی زیادہ بدتر اور ملحدانہ
ہے اور ان مشرکین کے اقوال کے مشابہ ہے جو کہا کرتے تھے کہ
اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے آباؤ اجداد نہ شرک کرتے نہ کسی شئے
کو اس کے حکم کے خلاف حرام ٹھیراتے (سورۂ انعام رکوع ۱۸) روئے
زمین پر ان لوگوں سے بڑھ کر تناقض پرست نہیں پایا جا سکتا،
اور حقیقت تو یہ ہے کہ جو شخص بھی کسی مسئلہ میں قضا و قدر سے استدلال
کرتا ہے وہ تناقض کی راہ پر ہے کیونکہ اس کے لئے کسی طرح بھی
ممکن نہیں کہ وہ ہر فرد بشر کو، اس کے ہر طرح کے اعمال پر ایک ہی
انجام کا مستحق قرار دے اور اس کے ہر فعل کو یکساں پسندیدگی کی نگاہ سے
دیکھے۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اگر کوئی ظلم کرتا ہے یا کوئی ظالم عام لوگوں پر
ظلم کرتا ہے، یا کوئی شخص زمین میں فساد انگیزی کرتا ہے۔ آمادۂ خونریزی
ہوتا ہے، لوگوں کی آبروریزیاں کرتا ہے اور اسی طرح کے دوسرے
خطرناک اور غارت گرانہ و وحشیانہ اقدامات پر اتر آتا ہے تو یہی شخص
اس ظلم کی مدافعت پر تیار ہو جاتا ہے اور اس ظالم اور مفسد کو ایسی
دردناک سزا دینے پر تل جاتا ہے جو دوسرے ظلم پیشہ لوگوں کے لئے
بھی عبرت کا سامان بن جائے۔ پس ایسے مواقع پر اس سے کہنا چاہیئے
کہ اگر قضا و قدر بھی کوئی "حجت" ہے تو پھر تم کیوں کسی شخص کی کسی

حرکت پر جیسے بہ جبیں ہوتے ہو، ہر شخص کو، جو کچھ بھی وہ کرنا چاہے

کرنے دو، اور اگر قضا و قدر کو یہاں تم حجت نہیں تسلیم کرتے تو پھر اپنے

اصل دعوے کو باطل سمجھ لو۔

درحقیقت اس قول کے ماننے والے ہر جگہ ایک ہی اصول سے

کام نہیں لیتے اور نہ اپنی بات پر جمتے ہیں۔ بلکہ اُن کی نگاہ ہمیشہ اپنی

خواہشات نفس کی طرف ہوا کرتی ہے۔ جہاں کہیں نفس کی تمنا برآری

ہو رہی ہوتی ہے، وہاں تو اِس اصول کو اصول تسلیم کرتے ہیں اور جہاں

کہیں نفس پر بار محسوس ہوا، اس کو پس پُشت ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ

اِن لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک صاحب علم نے کتنی موزوں

بات کہی ہے کہ "اطاعت کے موقع پر تو تم قدری ہوتے ہو اور معصیت

کے موقع پر جبری، جو مذہب بھی تمھاری خواہش نفس کے موافق دکھائی

دیتا ہے جھٹ اُسے قبول کر لیتے ہو"

(۲) دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اس اصول کو عام نہیں کرتے

اور اس کے اطلاق میں عوام و خواص کی تفریق کرتے ہیں۔ انھیں اپنی

تحقیق و معرفت کا بڑا ادّعا ہے۔ ان کا گمان یہ ہے کہ وہ شخص تو

احکام شرعیہ کا مکلف ہے جو اپنے افعال کے متعلق یہ احساس رکھتا

ہو کہ وہ خود اسی کے ارادہ اور اختیار کے تحت سرزد ہوتے ہیں۔ رہے

وہ لوگ جن کو یہ نظر آتا ہو کہ ان کے تمام افعال خدا ہی کے پیدا کردہ

ہیں ان میں ان کے اپنے ذاتی ارادہ و اختیار کا کوئی دخل نہیں ہے

بلکہ وہ ان کے کرنے پر مجبور کئے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن کے اندر یعنے اُن کے احوال و افعال میں اسی طرح اپنی منشاء کے مطابق تصرّف کرتا رہتا ہے جس طرح تمام متحرک چیزوں کو وہ حرکت دیا کرتا ہے تو ایسے لوگ اوامر و نواہیٔ شرع کے پابند و مکلف نہیں۔ یہ لوگ کہا کرتے ہیں تکلیفِ شرعی اس شخص سے ساقط ہو جاتی ہے جو ارادۂ الٰہی کا مشاہدہ حاصل کر لے چنانچہ ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ حضرتِ خضر اسی مقام پر تھے۔

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، اس طائفہ کے اقوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عوام اور خواص میں تفریق کرتے ہیں عوام کو تو مکلفِ شرع سمجھتے ہیں اور خواص کو نہیں۔ پھر "عوام" اور "خواص" کی مختلف تعریفیں بیان کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو حقائقِ تکوینی کا مشاہدہ حاصل ہو جائے اور یہ نظر آجائے کہ بندوں کے تمام افعال کا خالق خدا ہی ہے اور تمام کائنات محض اسی کے ارادہ اور مشیت کی تابع ہے ان کے سر سے تکلیفِ شرعی ساقط ہو جاتی ہے، اور کبھی کہتے ہیں کہ جو کوئی اس حقیقت کو صرف جانتا ہے، دیکھتا نہیں، اور بن دیکھے اُس پر ایمان رکھتا ہے وہ تو احکامِ شرع کا مخاطب ہے، اس کے سر سے تکلیف شرعی ساقط نہیں ہوتی، مگر جو شخص اس حقیقت کا شہود حاصل کرے اور اُسے آنکھوں سے دیکھ لے، وہ اوامر دینی کا پابند نہیں رہ جاتا۔

در اصل اس طرح پر یہ لوگ جبر اور اثباتِ قدر کو مانع تکلیف

قرار دیتے ہیں اور اس وہم بلکہ خطرناک گمراہی میں ایسے ایسے لوگ گرفتار ہوتے ہیں جن کو تحقیق و معرفت کا مردِ میدان اور توحید کا رمز شناس کہا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا دماغ یہ سوچنے اور سمجھنے سے قاصر رہا کہ بندہ کو اس امر کا بھی حکم دیا جا سکتا ہے جس کی خلاف ورزی کرنا اس کے لئے ارادۂ الٰہی میں متعین اور مقدر ہو چکا ہو۔ معتزلہ اور ان کے علاوہ دوسرے قدریہ کا ذہن بھی اس رازِ حقیقت کے ادراک سے عاجز ہو گیا تھا۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ نے ہر کہہ و مہ کے لئے احکامِ شریعت کی پابندی تو ضروری قرار دی اور کسی کے حق میں بھی سقوطِ تکلیف کے قائل نہیں ہوئے مگر انھوں نے قضا و قدر یعنے مشیت عامہ الٰہی اور خلق افعال عباد کا انکار کر دیا۔

اور ان کے مقابلہ میں ان لوگوں نے قضا و قدر کا تو اقرار کیا مگر تکلیف شرعی کے عموم کا ـــــ کیونکہ مطلق انکار ان کے لئے کسی طرح ممکن نہ تھا ـــــ انکار کر دیا اور اُن لوگوں کے سر سے اس کو ساقط ٹھیرا دیا جن کو مشاہدۂ قدر کا مقام نصیب ہو جائے۔ غور کرو تو نظر آئیگا کہ ان کا قول، معتزلہ کے قول سے زیادہ مبنی بر ضلالت ہے۔ یہی وجہ ہے سلف میں کوئی بھی اس کا قائل نہ تھا۔

اِن لوگوں کے نزدیک امر و نہی شرعی صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو حقائقِ تکوینی کے مشاہدہ سے بے بہرہ ہیں اور جو اِس منزل تک جا پہنچے ہیں، ان کو یہ احکامِ شریعت کی پابندیوں سے ماورا اور حق تعالےٰ

کے زمرۂ خواص میں سمجھتے ہیں۔ یہ اکثر اپنے اس قول کی تائید میں آیت کریمہ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (اور اپنے رب کو "یقین" کے آنے تک بندگی کر) کو پیش کرتے ہیں اور اس کی عجیب و غریب من گھڑت تاویل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "یقین" سے مراد یہی مقام شہود اور معرفت ارادۂ الٰہی ہے۔ لیکن یہ کھلا ہوا کفر ہے اگرچہ اس قول کے بیشتر قائلین کو اس کے کفر ہونے کا علم اور شعور نہ تھا کیونکہ اسلام کے اصول اور محکمات پر ایک نگاہ ڈال لینے ہی سے یہ بدیہی طور پر دکھائی دیتا ہے کہ شریعت کے احکام کی پابندی ہر ہر بندہ پر جب تک کہ اس کے اندر عقل و تمیز موجود ہو زندگی کے آخری لمحوں تک ہے۔ اور وہ کسی بندے سے کبھی اور کسی حالت میں بھی ساقط نہیں ہوتی۔ پس جو شخص دین کے اس بدیہی کلیہ کو نہیں جانتا، اسے جتانا چاہیئے اور تشریح کے ساتھ اس کو سمجھا دینا چاہیے لیکن اگر اس کے باوجود سقوطِ تکلیف شرعیہ کے اعتقاد پر جما رہے تو پھر وہ گردن زدنی ہے اور اسے قتل کر دینا چاہیئے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اس قسم کے ملحدانہ اقوال اور اعتقادات کا قرونِ اولیٰ میں کوئی وجود نہیں تھا، لیکن متاخرین میں یہ اقوال اور خیالات کثرت سے پائے جاتے ہیں، جو خدا اور اس کے رسول سے بغاوت اور معاندت کے ہم معنی ہے اور تکذیبِ انبیاء کے مرادف اگر ان باتوں کا کہنے اور اعتقاد رکھنے والا اس خطرناک گمراہی سے

واقف نہیں ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ یہی رسولِ خدا اور اولیاءاللہ کا طریقہ ہے تو دراصل اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ نماز اس پر فرض نہیں ہے، اس وجہ سے کہ اس کو وہ روحانی کمالات اور قلبی احوال حاصل ہیں جن کے ہوتے ہوئے اس کو نماز کی کوئی ضرورت نہیں یا یہ کہ شراب اس کے لئے حرام نہیں، اس لئے کہ وہ ان بندگانِ خاص میں سے ہے جنھیں شراب نوشی کوئی روحانی مضرت نہیں پہنچا سکتی۔ یا یہ کہ بدکاری اس کے لئے حلال ہے، اس بنا پر کہ وہ سمندر کی طرح ہو گیا ہے جس کو گناہوں کے خس و خاشاک گدلا نہیں کر سکتے۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ وہ مشرکین جنھوں نے اللہ کے پیغمبروں کو جھٹلا دیا اور ان کا رسول اور مطاع باذن اللہ ہونا تسلیم نہیں کیا وہ فکر کی دو اصولی غلطیوں میں مبتلا تھے۔ ایک تو بدعت دوسرے استدلال بالقدر۔ وہ کبھی ان بدعتوں کو اپنی مذہبی زندگی کی اساس ٹھیراتے تھے جو شریعتِ الٰہی کے سراسر خلاف تھیں اور کبھی احکامِ الٰہی کی پابندیاں قبول کرنے کے خلاف قضا و قدر سے استدلال کیا کرتے تھے۔

مشرکین کی یہی خصوصیات کسی نہ کسی رنگ میں ان لوگوں میں بھی موجود ہیں خواہ یہ خلافِ شرع بدعات کا ارتکاب کریں، خواہ قدر سے استدلال کریں یا بیک وقت دونوں گمراہیوں کے حامل ہوں، ان مشرکین سے ان کی اعتقادی مشابہت ہر حال اور ہر صورت میں

عیاں ہو مشرکین کی ایک خصوصیت یعنی استدلال بالقدر کے متعلق چند آیات قرآنی اوپر گزر چکی ہیں۔ وہی دوسری خصوصیت یعنے ان کی بدعت پرستی اور شریعت سازی سو اس کا تذکرہ اور پھر اس کی تردید و تکذیب بھی دوسرے مقامات کے علاوہ سورۂ انعام اور اعراف میں بالتفصیل بیان کی گئی ہے:۔

وَقَالُوا هٰذِهٖ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا اِلَّا مَنْ نَّشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءً عَلَيْهِ ؕ (انعام-۱۶)

اور ان مُشرکوں کا کہنا ہے کہ فلاں فلاں مویشی اور کھیت ہیں جو عام استعمال کے لیئے ممنوع ہیں۔ ان کو ان لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں کھا سکتا جن کو ہم چاہیں۔ اور کہتے ہیں کہ فلاں فلاں جانور ایسے ہیں جن کی پیٹھیں (سواری یا باربرداری کیلئے) حرام کردی گئی ہیں۔ اور کچھ خاص جانور ایسے ہیں جنھیں ذبح کرتے وقت وہ اللہ کا نام نہیں لیتے۔ (یہ لوگ یہ سب باتیں) خدا پر بہتان باندھنے کو کہتے اور کرتے ہیں۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ ...... وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ

اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ.... قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ...... قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ...... قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝ (الاعراف ۳۳-۲۷)

اے اولادِ آدم! شیطان تمھیں کسی فتنہ میں نہ مبتلا کر دے جس طرح کہ تمھارے والدین (آدم و حوّا) کو اُس نے جنت سے نکال باہر کرایا...... اور جب یہ مشرکین کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ کہو (اے نبی) کہ اللہ فحش کا حکم نہیں دیا کرتا...... ان سے کہدو کہ میرے رب نے عدل اور انصاف کا حکم دیا ہے اور یہ کہ تم ہر سجدہ کے ادا کرتے وقت اپنا رخ (اسی کی طرف) سیدھا رکھا کرو...... کہو (یعنے ان سے پوچھو) کہ اللہ کی پیدا کی ہوئی زینت (کپڑوں) کو جن کو اس نے اپنے بندوں کے واسطے پیدا کر رکھا ہے اور کھانے پینے کی

پاک چیزوں کو کس نے حرام کر دیا ہے؟ ...... انھیں بتا دو کہ میرے
پروردگار نے تو فحش باتوں کو ان میں سے جو ظاہر ہیں، انھیں بھی
اور جو چھپی اور ڈھکی ہیں ان کو بھی ...... اور گناہ کے کام کو، ظلم کو
اللہ کے ساتھ ایسی چیز کو شریک کرنے کو جس کے لئے اللہ نے کوئی
سند نازل نہیں فرمائی اور اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسی بات کہنے کو
جس کا تمھیں کوئی علم نہ ہو، حرام ٹھیرایا ہے۔

پھر ستم یہ کہ ان لوگوں نے اپنی من گھڑت بدعات کو "حقیقت"
کا نام دے رکھا ہے جس طرح اس قضائے الٰہی کو جس کا انھیں مشاہدہ
حاصل ہو جاتا ہے "حقیقت" کہا کرتے ہیں۔ اور اس "حقیقت" تک پہنچنے
کا راستہ ان کے نزدیک وہ "سلوک" ہے جس کا "سالک" اور راہرو
شارع کے امر و نہی کا پابند نہیں رہتا اس پر پابندی صرف اپنے مشاہدہ
اور ذوق و وجدان کی ہوتی ہے۔ اور قدر سے استدلال کا دعویٰ دراصل
ایک فریب ہے جس کو دوسروں کو خاموش کرنے کے لئے وہ استعمال
کیا کرتے ہیں ورنہ اس امر میں ان کا مرجع خود ان کے نفس کی خواہشات
اور ذہن کے تخیلات ہیں اور ہوا پرستی ان کے دین و مذہب کی اصل
ہے۔ اس باب میں وہ ان بدعت پرست جہمیہ وغیرہ کلامیوں سے کسی
طرح مختلف نہیں جو اپنے گھڑے ہوئے اور کتاب و سنت کے صریح
مخالف اقوال کو "حقائقِ علمیہ" قرار دیتے ہیں جن پر سمعیات یعنی
حقائق شرعیہ کو پسِ پُشت ڈال کر وہ ایمان و اعتقاد رکھنا ضروری

سمجھتے ہیں۔ رہ گئے کتاب اور سنّت کے نصوص، سو یا تو وہ ان میں تحریف کرتے ہیں یا کھلم کھلا بالکلیہ ان سے اعراض برت جاتے ہیں، نہ انھیں سمجھتے ہیں نہ ہی ان پر غور و فکر کرتے ہیں بلکہ کہتے یہ ہیں کہ ہم ان کے معانی تک نہیں پہنچ سکتے اس لئے انھیں خدا کے حوالہ کرنا چاہئے، حالانکہ پوری آزادی کے ساتھ ان نصوص شرعیہ کے خلاف معتقدات پر یقین رکھتے ہیں اور ایک موٹی عقل کا آدمی بھی انھیں مبادیٔ اسلام کے خلاف دیکھ اور سمجھ سکتا ہے مگر یہ ہیں کہ قرآن و سُنّت کے محکمات تک کو علم الٰہی کے حوالہ کر کے ہر طرح کی آزادی اور بے قیدی حاصل کئے ہوئے ہیں۔ پھر ان کے ان نام نہاد "حقائقِ عقلیہ" کی عقلیت کا حال یہ ہے اگر انھیں صحیح علم و عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو سارے کا سارا مجموعۂ جہل و خرافات ہی نظر آئے گا۔ بعینہ یہی حال ان "سالکین" کا ہے۔ اگر ان کے ان مخالفِ شرع اقوال اور اوہام کی چھان بین کی جائے جن کو وہ اولیاء اللہ کے حقائق گمان کرتے ہیں، تو وہ سب کے سب ان کے اپنے جی کی بنائی ہوئی باتیں اور نفس کی خواہشیں ثابت ہوں گے جن کا اتباع خدا کے باغیوں اور دشمنوں کا کام ہے نہ کہ اس کے دوستوں کا۔

راہِ حق سے منحرف ہو جانے کا سرچشمہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ انسان خدا کے نازل کئے ہوئے نصوص پر اپنے قیاس کو مقدم سمجھ لے اور امرِ الٰہی کو چھوڑ کر وہ اپنے نفس کا تبع بن جائے کیونکہ ہر شخص

کا ذوق اور وجدان اپنے مخصوص میلانات طبع کے مطابق ہوتا ہے محبت اور میلان سے کوئی دل خالی نہیں ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جیسی، اور جس قسم کی، کسی شخص کے دل میں محبت ہوگی اسی کے مُطابق اس کا مذاق اور وجدان بھی ہوگا مثلاً اہلِ ایمان کا ایک خاص ذوق اور وجدان ہوگا جو دوسروں کے اندر نہیں پایا جاسکتا اور جس کی تصویر کچھ اس حدیث صحیح کے اندر دیکھی جاسکتی ہے جس میں رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ :۔

"جس شخص کے اندر یہ تین چیزیں موجود ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت سے بہرہ ور ہوگا، ایک تو یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کو ہر شئے سے زیادہ محبوب ہوں۔ دوسرے یہ کہ جس شخص کی بھی وہ محبت کرے، صرف اللہ ہی کے لئے کرے۔ تیسرے یہ کہ کفر سے نکل آنے کے بعد پھر دوبارہ اس میں لوٹ جانے کو اتنا ہی بُرا اور ناپسندیدہ سمجھے جتنا کہ وہ آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے۔"

دوسری حدیث میں ہے :۔

"ایمان کا مزہ اسی نے چکھا جو اللہ کو اپنا رب، اسلام کو اپنا دین اور محمد کو اپنا پیغمبر تسلیم کرنے پر راضی ہوا۔"

اسی طرح کافروں، بدعتیوں اور ہوا پرستوں میں سے ہر ایک کا، اس کی خواہشوں اور محبتوں کے مطابق، ایک خاص اور علیحدہ وجدان

ہوتا ہے۔ سفیان ابنِ عینیہؒ سے پوچھا گیا کہ یہ کیا بات ہے کہ وہ لوگ جن کا دین وایمان صرف ان کی اہوا اور خواہشات نفس ہوتی ہیں وہ اپنی ان بے حقیقت اہوا وآراء سے بھی شدید محبت رکھتے ہیں انھوں نے جواب دیا کہ کیا تمھیں اللہ تعالیٰ کا یہ قول یاد نہیں کہ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْعِجْلَ بِکُفْرِھِمْ۔ (اور ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر بچھڑے کی محبت پیوست کردیگئی) یہی حال بت پرستوں کا ہے انھیں بھی اپنے بتوں سے اتنی ہی گہری محبت اور عقیدت ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ۝

لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا (الوہیت میں) دوسرے شرکاء ٹھیراتے ہیں جن سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ کی کی جاتی ہے، اور مومنوں کا حال یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ اللہ ہی سے محبت کرتے ہیں۔"

فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا یَتَّبِعُوْنَ اَھْوَآءَھُمْ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ ھَوٰہُ بِغَیْرِ ھُدًی مِّنَ اللّٰہِ۔

پس اگر یہ لوگ تمھارا جواب نہ دیں تو جان لو کہ وہ صرف اپنے

نفس کی خواہشوں کے پیرو کار ہیں، اور اس شخص سے بڑھ کر گمراہ
کون ہوگا جو اللہ کی نازل کی ہوئی کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہشِ
نفس کی پیروی کرے؟

إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ
وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ۔

یہ لوگ صرف اپنے گمان اور اپنی خواہشاتِ نفس کا اتباع
کرتے ہیں حالانکہ اُن کے رب کے پاس سے ان کے یہاں
ہدایت آچکی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ ہر شخص کا وجدان اور میلانِ طبع، اُس کے مخصوص
اعتقاد کے زیرِ اثر ہوتا ہے اور مجرد وجدانِ انسانی کو حقائق کی طرف
رہنمائی کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن ان نام نہاد اہلِ سلوک کا جن کے
طرزِ استدلال سے ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں۔ یہی حال ہے
ان کے اعتقادات اور اعمال کا قبلہ نما خود اُن کا اپنا ذوق اور
ہوائے نفس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ عموماً راگ باجے کے بڑے
شیدا ہوا کرتے ہیں اور اس راگ اور باجہ کا اثر نفسِ انسانی پر یہ
ہوتا ہے کہ وہ صرف محبتِ مطلقہ کے جذبات کو ابھار دیتا ہے
وہ محبتِ مطلقہ جو صرف اہلِ ایمان ہی کے اندر نہیں پائی جاتی
بلکہ اس میں خدا پرست، بت پرست، نسل پرست، وطن پرست
قوم پرست، زن پرست اور امرا پرست سب ہی برابر کے شریک

ہیں کیونکہ محبت سے تو کوئی دل خالی نہیں، اس لئے جس کے دل میں جو محبت ہو گی تمنوں کی گرمی اسی محبت کے شعلوں کو تیز تر کردے گی، یہ ضروری نہیں کہ صرف محبت ایمان ہی کو گرما دیا کرے اور دوسری محبتوں کو نہ اکسائے۔

یہ لوگ اپنے وجدان اور مذاق کے ایسے گہرے عقیدت کیش اور پختہ کار متبع ہوتے ہیں کہ قرآن و سنت کی ہدایات کو ان کے مقابلہ میں کوئی وزن نہیں دیتے اور ظاہر ہے کہ جس عبادتِ الٰہی کی تبلیغ کی خاطر خدا کے پیامبر دنیا میں آئے تھے اور جس طاعتِ خداوندی کی تذکیر انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد وحید تھا، اُس کا مخالف دینِ الٰہی کا پیرو کس طرح ہو سکتا ہے وہ پیرو تو دراصل اپنے ہوائے نفس کا ہوا۔

(۳) تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اس طائفہ میں سب سے زیادہ قدر و منزلت کے مالک ہیں۔ یہ لوگ مشہور فرائض دینی کے بجا لانے اور عام محرمات سے دور رہتے ہیں تو احکام الٰہی کی پوری پابندی کرتے ہیں لیکن غلطی یہ کرتے ہیں کہ اس عالم اسباب میں رہتے ہوئے اسباب کی طرف توجہ نہیں کرتے اور انھیں چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ یہ اسباب بھی دراصل عبادت ہی ہیں۔ ان کے اس طرزِ عمل کی بنیاد ان کا یہ گمان ہے کہ جب کوئی عارفِ کامل قدر کا مشاہدہ کر لیتا ہے تو پھر اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اُسے جد وجہد کی چنداں حاجت نہیں رہتی چنانچہ

ان لوگوں میں بعضوں نے صاف صاف اس امر کی تصریح کردی ہے کہ توکّل (یعنی کسی امر میں اپنی انتہائی کوشش صرف کرکے انجام کار کو خدا کے سپرد کر دینا) اور دعا اور اسی طرح کے دوسرے اوصاف ایمانی خواص کے مقامات نہیں بلکہ یہ تو عوام کے مقامات ہیں کیونکہ جو شخص قدرِ الٰہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا اس کو تو معلوم ہی ہو گیا کہ فلاں چیز صحیفۂ تقدیر میں لکھی ہوئی ہے اور وہ اپنے وقت پر ظہور میں آکر رہے گی، پھر اس کے لئے سعی و جہد کی ضرورت ہی کیا؟ لیکن یہ ایک عظیم الشان غلطی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کو ان کے اسباب کے ماتحت مقرر فرمایا ہے جس طرح کہ سعادت اور شقاوت اپنے اسباب کے ساتھ مقدر کی گئی ہیں جیسا کہ مخبرِ صادق نے ہمیں بتایا ہے :۔

"اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور اُن کے لئے جبکہ وہ ابھی پُشتِ پدر ہی میں تھے جنّت کو پیدا کیا اور وہ اہلِ جنت کا سا کام کرتے ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگوں کی تخلیق دوزخ کے لئے ہوئی ہے اور دوزخ اُن کے لئے اس وقت خلق کی گئی جب کہ وہ پشتِ آباء ہی میں تھے اور وہ اہلِ دوزخ جیسا عمل کرتے ہیں۔"

دوسری حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ صلعم نے صحابۂ کرام کو یہ حقیقت سنائی کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شئے کی تقدیر لکھ رکھی ہے تو انھوں نے کہا کہ یا رسول اللہ تو کیوں نہ ہم عمل کرنا چھوڑ دیں اور نوشتۂ الٰہی پر

بھروسہ کر کے بیٹھ رہیں؟ ہادی علیہ السّلام نے جواب دیا:۔

"نہیں ایسا نہ کرو، بلکہ عمل کرو، کیونکہ ہر شخص کے لیئے اس کام کی راہ آسان کر دی جاتی ہے جو اس کے لیئے مقدّر ہو چکا ہوتا ہے جو سعید ہے اس کے لیئے ایک سعید جیسے اعمال کی۔ اور جو شقی ہے، اس کے لیئے اشقیاء جیسے کاموں کی راہ ہموار کر دی جاتی ہے"۔

پس اللہ تعالٰی نے جن اسباب و ذرائع کے اختیار کرنے کی اپنے بندوں کو ہدایت فرمائی ہے۔ وہ خود بھی عبادت کی حیثیت رکھتے ہیں اور توکّل کا سر رشتہ تو عبادت سے پوری طرح ملا ہوا ہے۔ ذیل کی آیاتِ قرآنی کے الفاظ اور اسلوبِ بیان پر غور کرو:۔

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ

پس اُس کی عبادت کر، اور اُسی پر بھروسہ رکھ۔

قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ۔

کہہ وہ میرا پروردگار ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اُسی کے حضور مجھے لوٹ کر جانا ہے۔

(۴) چوتھی قسم ان لوگوں کی ہے جو واجباتِ دینی کو تو ادا کرتے ہیں مگر مستحبات اور نوافل کا کوئی اہتمام نہیں کرتے، سو اسی حساب سے ان کے درجات میں کمی اور پستی آجاتی ہے۔

(۵) پانچویں قسم ان لوگوں کی ہے جو کشف و کرامت اور خرقِ عادت

کی باطنی قوت پیدا کر لینے کی وجہ سے فریبِ نفس کا شکار ہو جاتے ہیں اور عبادت کی ادائیگی سے بے پروائی اور شکر خداوندی کی بجا آوری سے بے نیازی اختیار کر لیتے ہیں۔

ان گمراہیوں کا علاج یہ سب گمراہیاں، جن کا اوپر ذکر ہوا، اور اسی طرح کی بے شمار لغزشیں اہلِ سلوک و توجہ کو راہِ سلوک میں پیش آیا کرتی ہیں اور ان سے محفوظ رہنے کی صرف ایک ہی سبیل ہے اور وہ یہ کہ بندہ ہر لمحہ، و ہر آن، اُن احکامِ الٰہی کی سختی کے ساتھ پابندی کرے جنھیں دے کر اس نے اپنے رسول کو دنیا میں مبعوث فرمایا ہے۔

امام زہری نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جب انھوں نے فرمایا کہ "ہمارے اسلاف کہا کرتے تھے کہ سنت کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رہنے میں نجات ہے" اور یہ ایک لازوال اور بے ریب حقیقت ہے کیونکہ سنت کی مثال بقول امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کشتیٔ نوح کی سی ہے، جو اس میں جا بیٹھا اس نے نجات پائی اور جو اُس سے علٰحدہ رہا وہ غرق ہوا۔

اور یہ نصوصِ کتاب و سنت میں "عبادت" "طاعت" "استقامت" "اور لزومِ صراطِ مستقیم" وغیرہ الفاظ آتے ہیں تو ان میں صرف نام اور لفظ کا تعدد ہے، مسمّٰی اور مفہوم سب کا ایک ہی ہے اور اس مفہوم و مقصود کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک تو یہ کہ بندہ صرف اللہ ہی کی بندگی کرے دوسری یہ کہ یہ بندگی بھی اسی کے نازل کئے ہوئے اور بتائے ہوئے طریقہ

پر کرے نہ کہ اپنے من مانے طریقوں اور اپنے جی کے گھڑے ہوئے راستوں پر۔ قرآن کی ان آیتوں میں بھی یہی رازِ ہدایت مستور ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ؀

پس جو کوئی اپنے پروردگار کے روبرو ہونے کا کھٹکا رکھتا ہو اس کو چاہیئے کہ "عمل صالح" کرے اور اس کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ الخ

"ہاں، جس نے اللہ کے لیئے اپنی پیشانی جھکائی اور "احسان" کی روش اختیار کرتے ہوئے جھکائی اس کے لیئے اُس کے رب کے پاس اجر ہے"

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؀ الخ

اس شخص کے دین و طریق طاعت سے کس کا دین و طریق طاعت بہتر ہوگا جس نے اللہ کے لیئے اپنی گردن ڈال دی در آں حالیکہ وہ "احسان" کرنے والا ہو اور جس نے یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقہ کی پیروی کی؟

تینوں آیتوں کو ایک دوسرے کی روشنی میں دیکھو تو معلوم ہوگا کہ پہلی

آیت میں جس شئے کو عملِ صالح کہا گیا ہے، دوسری اور تیسری میں اسی کو "احسان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی عملِ صالح ہی کا دوسرا نام احسان ہے، اور احسان کے معنی ہیں "حسنات" کی بجا آوری اور حسنات ان چیزوں کو کہتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہوں اور اللہ و رسول کی پسندیدہ چیزیں وہی ہیں جن کے کرنے کا اس نے حکم دیا ہے۔ پس وہ بدعات، جن کی دین میں کوئی اصل و سند نہیں، اللہ اور رسول کو محبوب نہیں ہو سکتیں، اور جب وہ اللہ و رسول کو محبوب نہیں تو لازماً حسنات اور اعمالِ صالحہ میں سے بھی نہیں ہو سکتیں بالکل اِن فواحش و منکرات کی طرح جن کا فسق و فجور ہونا بدیہی ہے۔

وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا اور اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کے ٹکڑوں میں اخلاصِ دین کی ہدایت فرمائی گئی ہے، یعنی خدا کی طاعت اس یکسوئی۔ بے آمیزی اور خلوصِ باطن کے ساتھ کی جانی چاہیئے کہ اس کے کسی گوشہ میں ماسوا کا دھندلا سا بھی وہم نہ گزرنے پائے۔ حضرت عمرؓ دعا مانگا کرتے تھے کہ:۔

"خدایا! میرے ہر فعل کو صالح اور اپنے ہی لئے خالص کر اور اس میں کسی کا کچھ بھی حصہ نہ بنا۔"

فضیل ابنِ عیاضؒ نے آیت لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ "احسن" کے معنی ہیں "اخلص" اور "اصوب"۔ پوچھا گیا "اخلص" اور "اصوب" کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا

"عمل اگر خالص ہو لیکن صواب نہ ہو تو وہ عند اللہ مقبول نہیں، اسی طرح اگر صواب تو ہو مگر خالص نہ ہو تو بھی مقبول نہیں۔ بارگاہِ الٰہی میں وہی عمل لائقِ پذیرائی ہے جو خالص بھی ہو اور صواب بھی" خالص کا مطلب یہ ہے کہ خدا ہی کے لئے ہو، اور صواب کا مُدّعا یہ ہے کہ سُنّتِ رسول کے مطابق ہو"

ایک اعتراض اور اُس کا جواب اب یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر وہ تمام اعمال و صفاتِ انسانی جو خدا کے نزدیک پسندیدہ اور محبوب ہیں حدودِ عبادت میں شامل ہیں تو پھر ایسا کیوں ہے کہ قرآن مجید میں بارہا لفظِ "عبادت" پر دوسرے اعمالِ صالحہ یا صفاتِ حسنہ کو عطف کیا گیا ہے حالانکہ عطف دلیلِ مغائرت ہے؟ مثال کے لئے چند آیتیں ملاحظہ ہوں:-

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (فاتحہ)

خدایا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

فَاعۡبُدۡهُ وَ تَوَکَّلۡ عَلَیۡهِ۔

پس اسی کی عبادت کر اور اسی پر بھروسہ رکھ۔

اُعۡبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوۡهُ وَ اَطِیۡعُوۡنِ۔

اللہ کی عبادت کرو اُس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

پہلی آیت میں لفظِ "عبادت" پر استعانت کو، دوسری میں توکّل کو اور تیسری میں تقویٰ اور اطاعتِ رسول کو عطف کیا گیا ہے۔

لیکن یہ اعتراض اس غلط مفروضہ پر مبنی ہے کہ عطف ہمیشہ مغائرت کی دلیل ہوتا ہے۔ خود قرآن ہی کے اندر بے شمار جملے ایسے موجود ہیں جو اس مفروضہ کی تغلیط کرتے ہیں۔

مثلاً اِنَّ الصَّلوٰةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ میں فحشا پر منکر کا لفظ معطوف کیا گیا ہے۔ حالانکہ فحشاء منکر میں داخل اور اس کا ایک جزو ہے۔ نہ کہ اُس سے کوئی علیحدہ شئے۔ دوسری آیت میں فرمایا جاتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَاءِ ذِى الْقُرْبٰى الخ یہاں ایتاء ذی القربیٰ کو عدل واحسان پر عطف گردانا گیا ہے، حالانکہ قرابتداروں کی مالی اعانت عدل واحسان ہی کی ایک صورت ہے۔ تیسری جگہ ہے وَ الَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتَابِ وَ اَقَامُوا الصَّلوٰةَ یہاں اقامتِ صلوٰۃ کو تمسک بالکتاب پر عطف کیا گیا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ اقامت صلوٰۃ تمسک بالکتاب ہی کی ایک شکل بلکہ اس کا عظیم ترین مظہر ہے۔

ان شواہد سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ عطف ہمیشہ مغائرت ہی پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے مقاصد کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، مثلاً کبھی ایک لفظ دوسرے کا جزو ہوتا ہے لیکن اس پر عطف کر دیا جاتا ہے اور مقصد اس عطف کا لفظِ ثانی کی خصوصیت ذکر کا اظہار ہوتا ہے، اور کبھی ایک لفظ ایسا ہوتا ہے کہ مختلف مواقع

بیان کے لحاظ سے مختلف معانی رکھتا ہے، اگر وہ تنہا لایا جائے تو اس کے مفہوم میں وسعت اور عمومیت ہوتی ہے اور اگر کسی دوسرے لفظ کے ساتھ اس کا ذکر ہو تو اپنے مفہوم میں محدود اور خاص ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر فقیر اور مسکین کے الفاظ کو لو، یہی لفظ فقیر ہے جو آیت لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ میں تنہا آیا ہے۔ نیز یہی لفظ مسکین ہے جو آیت اَوْ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِيْنَ میں تنہا استعمال ہونے کے باعث فقیر کے مفہوم پر بھی حاوی ہے لیکن یہی دونوں الفاظ جب آیت اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ میں ایک ساتھ آ گئے تو دونوں کے الگ الگ مفہوم ہو گئے اور دونوں کی علٰحدہ علٰحدہ قسمیں ہو گئیں۔

اس طرزِ بیان یعنی ایک اسمِ عام پر اس کے کسی جزوِ خاص کو عطف کر دینے میں مختلف مواقع پر بلاغت کے مختلف رموز مدِ نظر ہوتے ہیں کہیں تو اس اسمِ خاص کی کسی ایسی خاصیت اور شان کو نمایاں کرنا مقصود ہوتا ہے جو اسمِ عام کے بقیہ افراد میں موجود نہیں ہوتی۔ اور کہیں لفظِ عام پر اطلاق اور اجمال کا پردہ پڑا ہوتا ہے جس کے نیچے اس کی عمومیت چھپ جاتی ہے اور اندیشہ ہوتا ہے کہ مبادا لفظِ عام کے کچھ افراد سامع کے ذہن میں آنے سے رہ جائیں اس لئے اس کے بعد اسمِ خاص کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔

اس اسلوبِ بیان اور اصولِ بلاغت کی مثالیں قرآن میں

کثرت سے ملتی ہیں، چند آیتیں ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، بعض مثالیں ذرا کسی قدر توضیح کے ساتھ اور پیش کی جاتی ہیں:۔

اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ۔

قرآن میں سے جو کچھ تمھارے اوپر وحی کیا گیا ہے اس کی "تلاوت" کرو اور نماز قائم کرو۔

"تلاوت کرو" کا مطلب محض زبان سے الفاظ کی ادائگی نہیں بلکہ اس کے احکام کا اتباع ہے، جیسا کہ ابن مسعودؓ نے آیت اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ "جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کی اس طرح تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کا حق ہے یعنے اس کے حرام ٹھیرائے ہوئے کو حرام قرار دیتے اور اس کے حلال کو حلال سمجھتے ہیں اسکی غیر واضح اور متشابہ آیتوں پر ایمان لاتے اور محکم آیتوں پر اپنے اعمال کی بنیاد رکھتے ہیں"۔ تلاوتِ کتاب یعنے اتباعِ کتاب، نماز اور نماز کی طرح تمام احکام و شرائع پر محیط ہے لیکن آیت زیر بحث میں تلاوتِ کتاب پر اقامتِ صلوٰۃ کو عطف کر کے اس کو مخصوص اہتمام کے ساتھ ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ اس کی اہمیت اور علوِ شان کی طرف نگاہیں اٹھ جائیں

(۲) اِتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا ۝

اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کرو۔

(۳) اِتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ

اللہ سے ڈرو اور اس کے (تقرب ورضا) کے لئے ذریعہ مہیا کرو۔

دیکھو ان دونوں آیتوں میں تقوی پر قولِ سدید اور ابتغاء وسیلہ کو عطف کیا گیا ہے، حالانکہ یہ چیزیں بجائے خود تقوی کی مکملات میں سے ہیں اور اس کی شاخ اور فرع۔ لیکن انھیں فوائد کے پیشِ نظر ان کا خصوصی تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ جن کی تشریح ہم اوپر کر آئے ہیں۔

ان تفصیلات اور ان اصول معانی و بلاغت کی روشنی میں ان آیتوں کے الفاظ پر نگاہ ڈالو جن کو بطور امثلہ اعتراض پیش کیا گیا ہے۔ ان میں "عبادت" کے لفظ پر توکل استعانت اور تقوی کے الفاظ کو معطوف کر کے لایا گیا ہے، سو اس عطف کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ چیزیں عبادت کے دائرہ سے باہر ہیں بلکہ یہ ہے کہ یہ چیزیں عبادت کے اجزاء تو ہیں لیکن عبادت کے لفظ عام کے بعد ان کا خصوصی ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ عابد کی نگاہ میں ان مخصوص اجزائے عبادت کی شانِ امتیاز جلوہ گر رہے اور وہ ان صفاتِ ایمانی کو ہمیشہ اپنی زندگی کے ایک ایک گوشہ میں جاری وساری رکھے۔ کیونکہ یہ چیزیں بقیہ ساری انواع عبادات کی صحیح صحیح بجا آوری میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں اور کوئی عبادت ان کی مدد کے بغیر ادا نہیں ہو سکتی۔

مخلوق کا معیارِ کمال اس پوری تقریر سے یہ حقیقت اب بالکل بے نقاب ہو جانی چاہیئے کہ انسانی یا غیر انسانی مخلوق کا کمال بزرگی اسی عبودیت میں پوشیدہ ہے۔ جس بندہ کی عبودیت جتنی ہی زیادہ بلند ہو گی اس کا درجہ اتنا ہی زیادہ اونچا اور قابلِ رشک ہو گا۔ اور جو شخص یہ گمان رکھتا ہے کہ مخلوق کے لیئے عبودیت کی منزل سے آگے نکل جانا ممکن ہے۔ یا کسی مخلوق کا کمال، عبودیت سے ماورائی ہو جانے میں ہے وہ جہل گمرہی کے اس مقام پر ہے جس کے آگے جہالت کی کوئی اور منزل باقی نہیں رہ جاتی۔ اس بحث کے آغاز میں متعدد آیات پیش کر کے ہم یہ بتلا چکے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی مقرب ترین مخلوقات کا مداحانہ ذکر کرنا چاہتا ہے تو انھیں "عبد" کا خطاب دیتا ہے اور عبادت ہی کو ان کی صفتِ امتیاز اور وجہ افتخار قرار دیتا ہے۔ اور جب کسی مخلوق کی مذمت کرنی ہوتی ہے تو اس پر یہی فردِ جرم لگاتا ہے کہ اس نے اپنی عبدیت کا حق ادا نہیں کیا اور میری عبادت سے روگرداں رہا۔ نیز ایک سے زائد نصوصِ قرآنی کے ذریعے سے اس امر کو بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر بھی دنیا میں بھیجے انھیں اسی پیغامِ عبادت کے ساتھ بھیجا اور ہر پیغمبر نے اپنی دعوت کی ابتدا اُعْبُدُوا اللّٰہَ کے الفاظ سے کی۔

عبدیت کے لحاظ سے لوگوں میں فرقِ مراتب جب تم پر عبادت کی یہ حقیقت روشن

ہو چکی تو ایک نگاہ میں تمہیں یہ بھی بدیہی طور پر محسوس ہو جانا چاہیئے کہ اس صفتِ مطلوب کے حصول میں لوگوں کے درمیان عظیم الشان فرق موجود ہے اور یہ فرق در اصل ایمان کے فرقِ مراتب کا مظہر یا اس کا دوسرا نام ہے۔ عبودیت کے مقامات اور صفات کمال کے لحاظ سے لوگ دو گروہوں میں بٹے نظر آتے ہیں ایک خواص کا گروہ دوسرا عوام کا گروہ۔ اور اسی بناء پر پروردگارِ عالم کی ربوبیت کا تعلق بھی تمام لوگوں کے ساتھ یکساں نہیں ہو سکتا بلکہ لازمی طور پر اس میں بھی تنوع اور عموم و خصوص پایا جانا ضروری ہے۔ بلکہ حد یہ ہے کہ توحید خالص اور عبودیت حقیقی کی علمبردار امت بھی شرک خفی کے باریک ترین جراثیم سے محفوظ نہ رہ سکی۔ چنانچہ صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تعس عبد الدرہم تعس عبد الدینار تعس عبد القطیفہ تعس عبد الخمیصہ تعس وانتکس واذا شیک فلا انتقش اذا اعطی رضی واذا منع سخط۔

ہلاک ہو بندۂ درہم، ہلاک ہو وہ بندۂ دینار برباد ہو نرم کمبل کا غلام، تباہ ہو مربع چادر کا بندہ، ہلاک ہو وہ اور اوندھے منہ گرا۔ اس کا حال یہ ہے کہ جب اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا ہے تو نکلتا نہیں (یعنے مصیبت پر بلبلا اٹھتا ہے)

اور جب اُسے کچھ دیا جائے تو مگن ہو جاتا ہے اور اگر محروم کر دیا جائے تو سخت بیزار۔

ترجمانِ حقیقت کے ان الفاظ پر غور کرو کہ آپ کس طرح زخارف دنیوی کے پیچھے پڑنے والے کو عبد الدرہم اور عبد الدینار وغیرہ کے الفاظ سے یاد کر رہے ہیں اور دعائے بد کے طور پر چند کلمات ارشاد فرماتے ہیں تو ساتھ ہی چند الفاظ میں ایک تمثیلی اسلوب بلیغ کے ساتھ اس کی زر پرست فطرت کا مرقع کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کی خوشی اور ناخوشی کا مدار حصول مال ہوتا ہے، جیسا کہ قرآنِ مجید بھی انسانی فطرت کی اس کمزوری پر شہادت دیتا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ لَمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ۝ (توبہ - ۷)

اِن منافقوں سے بعض صدقات کی تقسیم کے بارے میں تجھ پر معترضانہ اشارے کرتے ہیں۔ اگر اس میں سے انھیں کچھ دیا جاتا ہے تو خوش ہوتے ہیں اور اگر کچھ اُن کو نہ دیا جائے تو یکایک جل اٹھتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ ان کا خوش ہونا اللہ کو چھوڑ کر کسی اور ہی چیز پر منحصر ہے۔ ان لوگوں کا مدار رضامندی اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ ان کی اپنی خواہش اور دنیوی لذتیں ہیں۔ حالانکہ ایک بندہ کی عبدیت کا تقاضا یہ ہے

کہ اپنی رضا و عدم رضا کو رضائے الٰہی کا پابند بنا دے۔ ورنہ وہ عبدیت کے ادعا کے باوجود اس کے حقوق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ وہ زبان سے خدا کا بندہ ہے مگر دل مال کی بندگی کے نیاز سے خالی نہیں۔

یہی حال اُس شخص کا بھی ہے جو کسی ریاست یا کسی حسین صورت یا اسی نوع کی کسی اور ہوائے نفس پر مفتون ہو۔ وہ بھی مال و زر کے پجاری کی طرح اگر اپنی مطلوبہ چیز کو پا لیتا ہے تو سکون و مسرت میں سرمست ہو جاتا ہے۔ اور اگر نا کام تمنا رہ گیا تو اسی کے غم میں گھلتا رہتا ہے۔ اِس لئے اگر مذکورۂ بالا شخص حسب ارشادِ نبوی بندۂ سیم و زر ہے تو یہ بھی اپنی محبوب شئے کا بندہ اور غلام ٹھیرا، کیونکہ بندگی اور غلامی درحقیقت دل کی بندگی و غلامی ہے۔ جو چیز بھی قلب کو اپنا غلام اور اسیر بنا لے۔ انسان صحیح معنوں میں اسی کا بندہ اور غلام ہو جاتا ہے۔ اس شخص نے کتنی درخشاں حقیقت کا اظہار کیا جس نے کہا ؎

العبد حر ما قنع — والحر عبد ما طمع

غلام قانع ہے تو آزاد ہے — اور آزاد طامع ہے تو غلام ہے

یہی بات ایک اور شاعر ان لفظوں میں کہتا ہے۔ ؎

اطعت مطامعی فاستعبدتنی — ولو انی قنعت لکنت حرا

میں نے اپنی آرزوؤں کی اطاعت کی اور انھوں نے مجھے اپنا غلام بنا ڈالا اگر میں قناعت کرتا تو یقیناً آزاد رہتا۔

اہلِ دانش کہا کرتے ہیں کہ طمع گلے کا طوق ہے اور پاؤں کی بیڑی۔

گلے کو طوق سے آزاد کرتے ہی پاؤں کی بیڑی بھی غائب ہو جاتی ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگو سن لو کہ طمع فقر ہے اور ناامیدی غنا، جب تم میں سے کوئی شخص کسی چیز سے مایوس ہو جاتا ہے تو اس سے بے نیاز بھی ہو جاتا ہے۔" (مشکوٰۃ)۔ اور یہ ایک امر واقعہ ہے جس کی ناقابلِ انکار شہادت ہر انسان خود اپنے ہی اندر محسوس کر سکتا ہے۔ کیونکہ انسان کی جبلت ہی یہ ہے کہ جس شئے سے وہ ناامید ہو جاتا ہے اس کی طلب اور لالچ اپنے دل سے نکال دیتا ہے۔ پھر نہ تو وہ اس کی طرف نگاہِ احتیاج اٹھاتا ہے نہ ہی اس سلسلہ میں کسی معین و مددگار کی طرف۔ بخلاف اس کے، اگر وہ کسی معاملہ میں پُرامید ہوتا ہے اور اُس کا دل اس سے اٹکا ہوا رہتا ہے تو وہ اس کا بھی دیوانہ اور محتاج بنا رہتا ہے اور ان لوگوں کا بھی جن کے متعلق اس کو گمان ہوتا ہے کہ وہ اس چیز کے حاصل کرنے میں مفید ہو سکتے ہیں۔

فطرتِ انسانی کا یہ ایک عام اصول ہے۔ مال و زر۔ جاہ و دبدبہ حُسن و جمال، غرض جس شئے کو بھی لو، ہر ایک کی تمنا میں یہی اصول کارفرما نظر آئے گا خلیل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت ہے کہ:۔

فَابْتَغُوا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ
وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۔ (عنکبوت-۲)

اللہ ہی کے پاس اپنا رزق تلاش کرو اور اسی کی عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرتے رہو۔

رزق کے بغیر تو کوئی چارۂ کار نہیں، ہر انسان کو اُس کی ضرورت ہے، کہیں نہ کہیں سے اس کو حاصل ہی کرنا پڑے گا، سو ایک شخص اللہ سے اپنا رزق مانگتا ہے تو وہ اللہ کا بندہ ہوگا اور اسی کا محتاج اور اگر اللہ کو چھوڑ کر کسی مخلوق سے طلب رزق کرتا ہے تو دراصل اس مخلوق کا عبد ٹھیرا اور اسی کا حاجتمند۔

سوال کرنے کی ممانعت یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے کسی مخلوق سے کچھ مانگنا اصولاً حرام اور ممنوع ہے اور محض ضرورت کے وقت اس کی اجازت دی گئی ہے۔ گدائی کی ممانعت میں بے شمار حدیثیں وارد ہیں۔ مثلاً:-

(۱) "جو لوگوں سے مانگتا رہے گا قیامت کے دن وہ اس حال میں اٹھے گا کہ اُس کا چہرہ گوشت سے بالکل خالی ہوگا (یعنی نہایت ذلت و رسوائی کے عالم میں (بخاری و مسلم)۔

(۲) جس شخص نے غنی ہونے کے باوجود (یعنے اپنے لئے سامانِ زیست رکھتے ہوئے) سوال کا ہاتھ اُٹھایا، قیامت کے دن یہ سوال اس کے چہرے میں زخم کے گہرے یا ہلکے اوچھے نشانات بن کر ظاہر ہوگا ("یعنے سائل کے حالات اور کیفیت سوال کے لحاظ سے نشان ہائے زخم زیادہ یا کم گہرے ہونگے اور ساری مخلوق کے سامنے اُسے رسوا کریں گے)۔ (ترمذی)

(۳) "سوال کرنا حرام ہے سوائے تین شخصوں کے۔ ایک تو وہ

مقروض جو قرض کے بوجھ کے نیچے بری طرح پس رہا ہو، دوسرا وہ فقیر جس کو فقر و فاقہ کی شدت نے فرشِ خاک پر ڈال دیا ہو تیسرا وہ خونی ملزم جس پر دیت کا بار ہمت شکن ہو رہا ہو" (ابوداؤد)

(۴) "قسم خدا کی، اگر تم میں سے کوئی اپنی رسی اٹھائے اور اپنی پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھر اٹھا کر لائے اور بیچے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ اُس کی عزتِ نفس کو گدائی سے محفوظ رکھے، تو اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرے اور لوگ جی میں آئے دیں یا نہ دیں" (بخاری)

(۵) "جو سوال سے بچتا ہے اللہ اس کو غنی کر دیتا ہے، جو عفت اختیار کرتا ہے اللہ اس کو عفیف بناتا ہے اور جو مصیبت پر صبر اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے صابر بنا دیتا ہے۔ کسی شخص کو کوئی ایسی نعمت نہیں بخشی گئی جو صبر سے زیادہ بہتر اور وسیع ہو" (بخاری، مسلم)

(۶) اس مال (خزانہ بیت المال) میں سے اگر کچھ تمھیں ملے، اور تمھارا حال یہ ہو کہ نہ تو تم نے اس کو زبان سے مانگا ہو نہ ہی تمھارا دل اس کی طرف مائل ہو تو اس مال کو لے لو۔ اگر یہ صورتِ حال نہ ہو تو پھر اپنے نفس کو ایسے مال سے دور ہی رکھو"

گویا فی نفسہٖ اس مال میں کوئی پہلو کراہیت کا نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق لینے والے کی نفسیات سے ہے اگر دل اس کی حرص اور تمنائے

حصول سے خالی ہے تو پھر چنداں مضائقہ نہیں، کہ یہاں اس کی عبدیت کا جوہر بالکل محفوظ بچا رہتا ہے، اور اگر زبان سے سوال کر بیٹھا یا قلب کے کسی عمیق ترین گوشہ میں بھی اس مال کی خواہش دبی ہوئی ہے تو پھر ایک مومن کو ایسے مال کو ہاتھ لگانا روا نہیں کیونکہ یہاں اُس کے جوہر عبدیت کی پامالی کا اندیشہ ہے

کبار صحابہؓ کو سوال کی قطعی ممانعت

اوپر یہ تصریح گزر چکی ہے کہ اسلام کا مزاج سوال کرنے کو کبھی گوارا نہیں کرتا مگر بربنائے ضرورت مخصوص مجبوریوں کے موقع پر اس کی رخصت دی گئی ہے۔ مگر شارع علیہ السلام نے اپنے خاص صحابہ کو اس رخصت سے بھی منع فرما دیا اور انھیں عزیمت کی راہ اختیار کرنے کی ہدایت فرماتے ہوئے حکم دیا کہ کسی مخلوق سے کبھی کوئی سوال نہ کریں۔ چنانچہ مسند میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ سے کوئی چیز گر جاتی تو وہ کسی سے یہ نہ کہتے کہ ذرا اسے اٹھا دینا اور فرماتے کہ میرے دوست نے مجھے حکم دیا ہے کہ انسانوں سے کوئی سوال نہ کروں"۔ صحیح مسلم میں حضرت عوف بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کے ساتھ مجھ سے بیعت لی اور ہم سب کے کانوں میں آہستہ سے یہ بات ڈال دی کہ کسی سے کبھی کوئی سوال نہ کریں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں سے اگر کسی کے ہاتھ سے کوڑا چھوٹ کر گر پڑتا تو وہ کسی سے یہ نہ کہتا کہ اُسے اٹھا کر مجھے دو۔

خدا ہی سے سوال کرنے کا حکم

ایک دو نہیں بلکہ متعدد نصوص کتاب

اور سنت میں موجود ہیں جن میں حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ مانگنا ہو رزاق حقیقی سے مانگو کسی مخلوق کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ

(الم نشرح)

پس جب تم خالی ہو تو کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب ہی سے التجا کرو۔

وَاسْئَلُوا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ (نساء ۵)

اور اللہ سے اس کا فضل (رزق) مانگتے رہو۔

فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ (عنکبوت۔۲)

یہ آخری فقرہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ارشاد ہے۔ اس کے الفاظ کو دیکھو فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ فرمایا فَابْتَغُوْا الرِّزْقَ عِنْدَ اللّٰہِ نہیں کہا۔ کیونکہ عِنْدَ اللّٰہ کے الفاظ کو مقدم کر کے حصر اور اختصاص کا پہلو نمایاں کرنا مدنظر تھا گویا یوں فرمایا کہ رزق کسی غیر خدا کے یہاں مت تلاش کرو۔ بلکہ صرف خدا ہی کے دربار سے اس کو مانگو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن عباس کو نصیحت فرماتے ہیں:۔

اگر کچھ مانگنا ہو تو اللہ سے مانگو اگر مدد چاہنی ہو تو اللہ سے چاہو۔"

ہر انسان بتقاضائے بشری دو چیزوں کا حاجتمند ہوتا ہے۔"

ایک تو رزق وغیرہ ضروریاتِ زندگی، دوسری حفاظت دفعِ مضرت ان دونوں امور میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے لیے انسان جب پکارے تو اللہ ہی کو پکارے۔ ضرورت کے وقت اُسی کے آگے ہاتھ پھیلائے اور مصیبت کے موقع پر اسی سے فریاد کرے جیساکہ یعقوب علیہ السلام کا اسوہ ہمارے سامنے ہے کہ بیٹے کے غم کی شدت جب برداشت نہ ہوسکی اور وفورِ اضطراب میں لبہائے مُبارک بے اختیار متحرک ہونے لگے تو ان سے جو صدا نکلی وہ یہ تھی کہ:۔

اِنَّمَآ اَشْكُوْ بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (یوسف)

میں اپنی پریشانی اور رنج وغم کا گلہ صرف اللہ سے کرتا ہوں۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے "ہجرِ جمیل" کو بطور اخلاق کمالیہ کے ذکر فرمایا ہے علماء نے ان الفاظ کی تشریح میں فرمایا ہے کہ "ہجرِ جمیل" کے معنی ہیں کسی کو کوئی تکلیف پہنچائے بغیر خاموشی کے ساتھ اس سے الگ ہو جانا۔ اور "صفحِ جمیل" کے معنی ہیں پیشانی پر آثارِ عتاب لائے بغیر کسی کو معاف کر دینا۔ اور "صبرِ جمیل" کے معنی ہیں زبان پر کسی مخلوق کے سامنے حرفِ شکایت لائے بغیر صبر کر جانا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ کو حالتِ مرض میں جب یہ سُنایا گیا کہ امام طاؤسؒ مریض کے کراہنے کو مکروہ سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ شکوۂ مخلوق ہے تو امام موصوف نے کراہنا موقوف کر دیا اور پھر اس کے بعد مرتے دم تک ان کے منہ سے آہ کا لفظ نہ سُنا گیا۔

رہ گیا مصائب کے وقت حضرت باری تعالیٰ میں عرض شکایت
کرنا سو یہ صبر جمیل کے منافی نہیں جس کی شہادت حضرت یعقوب
علیہ السلام کے الفاظ سے ملتی ہے کہ ایک طرف آپ فَصَبْرٌ
جَمِیْلٌ فرماتے ہیں اور ساتھ ہی اِنَّمَآ اَشْكُوْ بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ
اِلَى اللّٰهِ بھی کہتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز فجر میں سورہ یونس و یوسف اور نحل
کی قرأت کرتے ہیں اور جب اس آیت (اِنَّمَآ اَشْكُوْ الخ) پر پہنچتے
ہیں تو رو پڑتے ہیں اور رونے کی آواز آخری صفوں تک سنائی دیتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے الفاظ یہ ہیں:۔

"خدایا! حمد کا کلی استحقاق تجھی کو ہے، تو ہی ہماری شکایتوں
کا مرجع ہے، تو ہی ہمارا سہارا ہے اور تو ہی ہمارا فریاد رس، تیرا
ہی بھروسہ ہے اور جو قوت اور توانائی ہمیں ملتی ہے تیری جناب سے۔"

طائف کے اشقیا نے جب رحمۃ للعالمین کے ساتھ اپنی مشہور
اور رسوائے عالم درندگی کا مظاہرہ کیا تو زبانِ مبارک پر یہ کلمات
جاری تھے:۔

"اے اللہ! میں اپنی ناتوانی، اپنی بے چارگی اور اپنی کس مپرسی
کا تجھی سے گلہ کرتا ہوں، تو ہی ناتوانوں کا پروردگار ہے، اور
تو ہی میرا پروردگار الخ۔"

ان واقعات اور تفصیلات کی روشنی میں یہ حقیقت کسی بحث و تمحیص

کی محتاج نہیں رہ جاتی کہ اللہ کی بارگاہ میں اپنی شکایتوں کو پیش کرنا اور اپنی مصیبتوں کے متعلق عرض و معروض کرنا ممنوع اور مذموم نہیں بلکہ مامور اور ممدوح ہے اور جو بندہ اپنی حاجت برآری کے لئے اللہ کے فضل و کرم کا جتنا ہی زیادہ حریص ہوگا اس کی عبدیت اتنی ہی زیادہ پختہ اور خالص۔ اور ماسوا سے اس کی بے نیازی اتنی ہی زیادہ محکم اور کامل ہوگی جس طرح کسی مخلوق کی حرص اور رغبت اس کی عبودیت کی موجب، اور اس سے مایوسی اور بے رغبتی اس سے قلب کی بے نیازی کی باعث ہوتی ہے۔ اسی طرح خالق اور رازق حقیقی کی نعمتوں اور نقمتوں کی حرص و رغبت اس کی عبودیت کی موجب ہے اور قلب انسانی کا اس کی طلب و احتیاج سے اعراض کرنا اس کی عبودیت سے اعراض کرنے کے مرادف ہے۔ یہ خطرہ ان لوگوں کے حق میں تو بہت زیادہ شدید ہے جو خالق کی طرف سے اپنی طلب و رجا کا رشتہ توڑ کر کسی مخلوق سے اس طرح جوڑ لیں کہ اسی کو اپنی امیدوں کا مرکز بنالیں اور اسی پر اپنے اعتماد قلب کی عمارت تعمیر کرلیں مثلاً کوئی اپنی ریاست، اپنی حکومت، اپنی فوج اور اپنے خدم و حشم پر اعتماد کر بیٹھے یا کوئی اپنے اہل و عیال اور احباب و اقارب پر، یا اپنے ذخائر دولت پر اور خزائن سیم و زر کو اپنا مرجع التفات بنالے۔ یا اپنے کسی آقا، کسی فرمانروا، کسی مخدوم

کسی پیر، کسی مرشد اور اسی طرح کے دوسرے بزرگوں کو، جو فنا ہو چکے ہوں، یا جن کا فنا ہونا بہر حال یقینی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور نصیحت اپنے ہر بندہ کے لیئے یہ ہے کہ :۔

تَوَکَّلْ عَلَی الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِہٖ وَکَفٰی بِہٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِہٖ خَبِیْرًا۔

(فرقان - ۵)

اس اللہ پر بھروسہ کر جو زندۂ جاوید ہے جس کو کبھی فنا نہیں اور اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کر اور اللہ اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے کے لئے کسی غیر کا ضرورتمند نہیں۔

اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جس شخص کا دل بھی مخلوقات کی طرف اس توقع کے ساتھ مائل ہوگا کہ وہ اس کے کسی اڑے وقت میں کام دیں گی یا اُسے روزی مہیا کریں گی یا اس کو راستی اور ہدایت عطا کریں گی۔ یقیناً اُس کے دل میں ان کی عظمت پیدا ہو گی اور وہ ان کے سامنے عاجزانہ جُھکا ہوا ہو گا اور انجامِ کار اسی اعتقاد اور اسی تذلّل کے تناسب سے اس کے اندر ان کی عبدیت اور بندگی بھی ضرور پیدا ہو جائے گی اگرچہ بظاہر وہ ان کا امیر اور سردار اور آقا و فرمانروا ہی کیوں نہ ہو کیونکہ حکیم کی نگاہ تو ظواہر پر نہیں ہوتی حقائق پر ہوتی ہے۔

حُبِ غیر بندگیٔ غیر | چنانچہ جب کوئی شخص کسی عورت کے حُسن و جمال سے متاثر ہو جاتا ہے، تو خواہ وہ عورت شرعاً اس کے لئے مباح ہی کیوں نہ ہو، اس کا دل اس کا اسیر محض بن کر رہ جاتا ہے اور وہ جس طرح چاہتی ہے اس کو اپنی انگلیوں پر نچاتی رہتی ہے حالانکہ ظاہر میں وہ اس کا آقا اور سردار ہوتا ہے کیونکہ اس کا شوہر ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ اس کا محکوم اور مملوک ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت، جب کہ اس عورت کو بھی اس کے نیاز عشق اور فریفتگی شوق کا علم ہو جائے اور اُسے یقین ہو جائے کہ کسی حال میں بھی اس کی مفارقت اس کو گوارا نہیں ہو سکتی۔ اور خواہ کچھ ہی ہو جائے لیکن اس کو چھوڑنے اور کسی دوسری عورت سے رفاقت زندگی کا رشتہ جوڑنے کا تصور بھی اس کے لئے جانکاہ ہے۔ پھر تو وہ اُس پر اس طرح آمرانہ حکومت کرتی ہے جس طرح کوئی ظالم اور قاہر آقا اپنے زرخرید اور مجبور محض غلام پر، بلکہ اس سے بھی زیادہ سختی اور مطلق العنانی کے ساتھ۔ کیونکہ روح کی قید جسم کی قید سے اور روح کی غلامی جسم کی غلامی سے کہیں زیادہ مُستحکم ہوتی ہے، جس انسان کا بدن قید و بند غلامی میں ہو لیکن دل قید کے اثرات سے آزاد اور محفوظ رہے تو اس کو اس کی چنداں پروا نہیں ہوتی، بلکہ بسا اوقات اس قید سے رہائی کا امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جب سلطنت جسم کے بادشاہ ــــ قلب ــــ

پر یہ آفت آجاتی ہے اور وہ کسی غیر اللہ کے دامِ قید یا حلقۂ غلامی میں جا پھنستا ہے تو پھر اس کی غلامی حقیقی غلامی ہوتی ہے اور یہ غلامی دراصل تذلّل اور عبودیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ اور قلب کی بندگی اور محکومی ہی وہ شئے ہے جس پر ثواب اور عذاب کا ترتب ہوتا ہے۔ چنانچہ تمھیں معلوم ہوگا کہ اگر کسی مُسلمان کو کوئی کافر ظلماً قید کرلے اور کوئی فاسق اس کو زبردستی غلام بنالے تو یہ چیز اس کے دین و ایمان کے حق میں کچھ بھی مضرت رساں نہیں بشرطیکہ اس قید اور غلامی میں بھی اپنی مقدرت کے مطابق وہ واجباتِ دینی ادا کرتا رہے اسی طرح اگر مسلمان واقعتہً کسی کا غلام ہے اور وہ اللہ کے حقوق بھی ادا کرتا رہتا ہے اور اور اپنے دنیوی آقا کے حقوق بھی۔ تو اُس کے لیئے اللہ کے ہاں دہرا اجر ہے۔ حد یہ ہے کہ اگر کوئی مُسلمان کفار کے ہاتھوں میں پڑ کر کلمۂ کفر کہنے پر مجبور ہوجائے لیکن دل میں ایمان کا اقرار موجود ہو تو یہ ظاہری اقرارِ کُفر اس کی اسلامیت پر ایک سر مو بھی اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ بخلاف اس کے جس کا دل ہی کسی غیر مخلوق کا غلام بن جائے تو یہ اُس کے ایمان کے لیئے تباہ کُن ہے خواہ ظاہر میں وہ ایک سلطنت کا حکمران ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیئے کہ حریت اور عبودیت کا انحصار قلب پر ہے نہ کہ جسم پر جس طرح کہ توانگری کا تعلق قلب سے ہے نہ کہ مال سے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "غنا اور تونگری کا انحصار مال و دولت کی فراوانی پر نہیں ہے بلکہ دل پر ہے اور اصل تونگری دل کی تونگری ہے"۔

یاد رہے کہ یہ نتیجہ تو اس عشق کی نیاز مندیوں کا ہے جو شرعی طور پر کسی مباح صورت سے تعلق رکھتا ہو۔ اور اگر کہیں بدقسمتی سے کسی کا دل کسی غیر عورت یا کسی حسین لڑکے کی محبت میں غرق ہو گیا ہو اور وہ اس کے عشق کے آستانہ پر اپنی متاعِ قلب نثار کرے تو پھر یہ وہ سراپا عذاب ہے جس کے اندر کسی خیر اور ثواب کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا شخص ان بدبختوں میں ہے جو رحمتِ الٰہی سے سب سے زیادہ دور اور عذابِ خداوندی سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ کیونکہ کسی حسین صورت کا عاشق جب تک اس حسین صورت کے تصور میں ڈوبا ہوا اور اس کا پرستار بنا رہتا ہے، اس وقت تک وہ اور اس کے دل و دماغ، خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے بے شمار مفاسد اور خبائث کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں، اور اگر بالفرض وہ اس سلسلہ میں فاحشۂ کبریٰ کے ارتکاب سے بچا بھی رہے تو بھی صورتِ محبوب کے تصور میں اس کے قلب کا دائمی انہماک بلا ارتکاب فاحشہ ہی اس کے حق میں اس امر سے زیادہ ضرر ناک ہے کہ وہ کوئی بڑے سے بڑا گناہ کر ڈالے اور پھر اس سے اس طرح تائب ہو جائے کہ قلب اس گناہ کے ارتکاب سے بالکل پاک ہو جائے۔ ایسے بوالہوسوں اور عاشقوں کا حال تو مستوں اور مجنونوں کا سا ہوتا ہے

بلکہ اُن سے بھی بڑھ کر، کہ مجنون کو تو کبھی ہوش بھی آجاتا ہے مگر انھیں اپنے خمارِ عشق سے ایک لمحہ بھی رہائی نصیب نہیں ہوتی۔

غیر اللہ میں انہماک خدا سے تغافل

اس آفتِ روحانی کے سلسلے کی سب سے بڑی اور آخری بدبختی یہ ہے کہ قلب اللہ کے ذکر اور فکر سے یکسر خالی ہوجاتا ہے اور حلاوتِ ایمانی کے احساس سے بالکل محروم۔ اگر انسان کا دل اخلاصِ ایمانی اور عبادتِ الٰہی کا لذت آشنا ہو تو پھر اس کی نگاہ میں کوئی شئے بھی اس سے شیریں تر اور مرغوب تر نہیں رہ جاتی کہ اس کی طرف والہانہ رغبت کے ساتھ متوجہ ہوسکے کیونکہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ کسی محبوب چیز کو اسی وقت چھوڑتا ہے جب اس کو کوئی اس سے زیادہ محبوب چیز میسر آجائے یا یہ کہ کسی بڑے نقصان اور مصیبت کا اُس کو خوف ہو۔ پس حُبِّ فاسد سے قلبِ انسانی کو یا تو عشقِ صالح آزاد کرا سکتا ہے یا کوئی بڑا اندیشۂ زیاں۔ اللہ تعالیٰ یوسف علیہ السلام کے رازِ عفّت کے متعلق فرماتا ہے:۔

كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوٓءَ وَالْفَحْشَآءَ
اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ٥ (یوسف ۳)

ایسا ہوا تا کہ ہم یوسفؑ کو برائی اور بے حیائی سے بچالیں
یقیناً وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھا۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ قلب مومن کو بتلائے "سوء" ہونے سے

یعنے حسنِ انسانی کی طرف کسی غیر مناسب طریقہ پر مائل ہونے اور اس کے دام میں گرفتار ہونے سے ـــــ بچاتا ہے اور اس کے اخلاصِ ایمانی کے صدقہ میں "فحشاء" سے اُسے محفوظ رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب تک انسان حقیقی ذوق، اخلاص اور سچی لذّت عبودیت سے شاد کام نہیں ہوتا اس کا نفس اُسے اپنی خواہشات کی چاکری میں لگائے رہتا ہے اور وہ اس کے سامنے بے بس بنا رہتا ہے مگر جب وہ ایک بار اخلاص کا لذت شناس ہو لیتا ہے اور اس کی قوتیں دل میں راسخ ہو جاتی ہیں تو بغیر کسی کشاکش کے خواہشاتِ نفس اس کے آگے ماتھا ٹیک دیتی ہیں قرآن کے بیان کردہ فلسفۂ نماز میں ہمیں یہی اصول ملتا ہے :-

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ؕ (عنکبوت - ۵)

بلاشبہ نماز بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے، اور اللہ کی یاد سب سے بڑی چیز ہے (جو نماز سے حاصل ہوتی ہے۔)

یعنے نماز کی افادیت کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو مکروہات فطری یعنے فحشا اور منکر ـــــ کا استیصال، دوسرے ایک شئے محبوب یعنے یادِ الٰہی کا حصول۔ باعتبار مقصد دوسرا پہلو پہلے سے اہم اور افضل ہے کیونکہ اللہ جلشانہ کی یاد اور اس کی عبادت ہی مقصود بالذات ہے اور مکروہات کا اندفاع اس راہ کی ایک ناگزیر منزل اور اس کے

حصول کا زینہ ہے اِس لئے اس کی حیثیت ثانوی اور تبعی ہوئی۔
قلبِ انسانی ایک ایسی مخلوق ہے جو طبعاً حق پسند اور حق طلب
واقع ہوئی ہے، اس لئے جب بُرائی کا تصور اُس کے سامنے آتا ہے
تو وہ اُسے دور دھکیلنے کی سعی کرتا ہے کیونکہ برائیاں اور بُرے خیالات
اُس کو اِس طرح تباہ اور برباد کر دیتے ہیں جس طرح خود رو گھاس
پات زراعت کو۔ یہی حقیقت ہے جو ذیل کی آیات میں ہمیں ذہن
نشین کرائی گئی ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ
دَسّٰهَا ﴿والشمس﴾

بامُراد ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کیا اور نامراد رہا
وہ جس نے اُس کو آلودہ کیا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی
﴿سبح اسم﴾

اس نے فلاح پائی جس نے اپنے کو پاک کیا اور اپنے پروردگار کو
یاد کیا اور نماز پڑھی۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ
یَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِکَ اَزْکٰی لَهُمْ ﴿نور ۴﴾

مومنوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں جھکائے رکھیں اور اپنی
شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ طریق کار اُن کے لئے سب سے زیادہ

پاکیزہ ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ مَازَکٰی مِنْکُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا (نور۔۳)

اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہو سکتا۔

دیکھو کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے "غضِ بصر" اور "حفظِ فروج" کو نفس کے لئے "ازکیٰ" یعنے پاکیزہ قرار دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ ترکِ خواہش پاکئِ نفس کا ایک بنیادی جزو ہے۔ اور پاکِ نفس ایسا جامع لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نفس تمام برائیوں سے ــــ مثلاً فواحش مظالم، جھوٹ اور شرک وغیرہ سے پاک اور بے لوث ہو جائے۔

یہی حال اُس شخص کا بھی ہے جو کسی حکومت کا طالب ہوتا ہے۔ اور زمین پر اپنی فرمانروائی اور سرداری اور کبریائی کا سکہ بٹھانا چاہتا ہے۔ اندر سے دیکھو تو وہ بھی اپنے معینوں اور مددگاروں کا غلام نظر آوے گا اگرچہ ظاہر میں وہ ان کا رئیس اور مطاع دکھائی دیتا ہے اُس نے اپنے اوپر آقائی اور حکمرانی اور آمریت کی جو نقاب ڈال رکھی ہے اس کے نیچے دراصل وہ دل ہے جو اپنے اتباع اور اعوان وانصار کے خوف ورجا سے لبریز ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اُن کے لئے اپنے خزانوں کے منہ کھولے رکھتا، بڑی بڑی جاگیریں بخشتا رہتا ہے اور ان کی کتنی ہی لغزشیں دیکھتا ہے مگر چشم پوشی کرجاتا ہے۔ آخر کیوں؟

صرف اس لیئے تاکہ وہ اس کی اطاعت اور اعانت کے لئے تیار رہیں اور اس کے حسبِ منشاء جد و جہد کرنے سے دریغ نہ کریں۔ ورنہ لیلائے حکومت کی تمنا حسرت ہی بن کر رہ جائے۔ پس ظاہر میں وہ ان کا آقا اور مطاع ہے پر حقیقت میں وہ خود ہی ان کا مطیع اور غلام ہے۔

لیکن اور ذرا گہری نظر سے دیکھو تو محسوس ہو گا کہ یہ دونوں ہی ایک دوسرے کے غلام ہیں اور ہر ایک کے اندر دوسرے کی عبودیت موجود ہے کیونکہ ہر ایک دوسرے کا اپنے آپ کو محتاج پاتا ہے۔ اس لئے یہ سب کے سب عبادتِ الٰہی کی حقیقت سے بے بہرہ ہیں اور اگر ان دونوں کا مذکورہ تعاون خدا کی زمین پر ظالمانہ طور پر علو اور تمکن حاصل کرنے کے لئے ہو تو ان کی حیثیت ان دو بدباطنوں کی سی ہو جاتی ہے جو کسی بدمعاشی یا رہزنی میں ایک دوسرے کی امداد کریں۔ الغرض ہوائے نفسی اور اغراض نفسانی ہی وہ چیزیں ہیں جنھوں نے اس فرمانروا کو اپنے نام کے فرمانبرداروں کا اور ان فرمانبرداروں کو اس نام نہاد فرمانروا کا عبد اور غلام بنا رکھا ہے۔

مال و دولت کا حریص بھی اسی صورتِ حال کا اسیر ہوتا ہے اگر عاشقِ صورت، حسنِ صورت کا۔ اور طالبِ ریاست اپنے سپاہیوں اور سپہ سالاروں کا پرستار ہے تو یہ اپنی زندگی مال و زر

کی عبودیت اور پرستش میں نذر کرتا ہے۔

اشیاءِ مادی کی دو قسمیں اس تنقیح سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اسلام ترکِ دنیا کی تعلیم دیتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ امور مادی اور اشیائے دنیوی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جن کی احتیاج انسان فطری طور پر رکھتا ہے مثلاً کھانا، پانی، لباس مکان، بیوی وغیرہ، سو ان چیزوں کے حصول میں بندۂ مومن کی روش یہ ہوتی ہے کہ وہ انھیں اللہ ہی سے مانگتا ہے اور ان کے لئے اللہ ہی کے حضور میں رجوع کرتا ہے اور وہ مال و اسباب جن سے وہ اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے میں کام لیتا ہے، اُن کی حیثیت اس کے نزدیک اس گھوڑے یا گدھے سے جس پر وہ سوار ہوا کرتا ہے، یا اس فرش سے جس پر وہ بیٹھا کرتا ہے، بلکہ اس قدمچہ سے بھی جس پر وہ بیٹھ کر رفعِ حاجت کرتا ہے۔ زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ اسباب زندگی اس کو ایسا گرویدہ نہیں بنا لیتے کہ وہ بس انھیں کا ہو رہے اور اس پر اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا کی کیفیت طاری ہو جائے۔

دوسری قسم ان چیزوں کی ہے جن کی ضرورت، انسانی زندگی کے لئے فطری نہیں۔ ایسی چیزوں کی فکر اور تمنائیں ہر گز دان ہونا ایک بندۂ خدا کا شیوہ نہیں۔ اور اگر ان چیزوں سے وہ دلی وابستگی پیدا کرے گا تو یقیناً وہ اس کو اپنا غلام بنا لیں گی اور ایسا اوقات

ایسا ہوگا کہ وہ اُن کے لئے غیر اللہ پر اعتماد کرنے لگے گا جس کے بعد قلب میں حقیقی عبودیت اور توکل علی اللہ کا وجود ایک امر ناممکن ہے بلکہ صاف صاف یوں کہنا چاہیئے کہ اس کے اندر غیر اللہ کی عبدیت اور غیر اللہ پر توکل اگر مکمل طور پر نہیں تو جزوی طور پر پایا جانا ضروری ہے۔ ایسا آدمی ارشادِ نبوی تعس عبدالدرہم الخ کا اولین مصداق ہے۔ کوئی شک نہیں ہے کہ وہ انھیں درہم و دنانیر اور دوسرے مزخرفات دنیوی کا بندہ ہو رہتا ہے خواہ وہ ان چیزوں کو اللہ ہی سے کیوں نہ مانگے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے مانگنے کے باوجود وہ اس کے فیصلوں پر صابر اور شاکر نہیں رہتا اگر اللہ تعالیٰ اس کی سعی کردے تب تو خوش، اور اگر نہ کرے تو ناخوش۔ کیا اللہ کی بندگی کے یہی معنی ہیں؟ اللہ کا بندہ تو وہ ہوتا ہے جو اس چیز سے خوش ہوتا ہے جس سے اللہ خوش ہو اور اس چیز سے بیزار ہوتا ہے جس سے اللہ بیزار ہو۔ اس شئے کو پسند کرتا ہے جس کو اللہ اور اس کا رسول پسند کرتے ہوں اور اس شئے سے نفرت کرتا ہے جس سے اللہ اور رسول نفرت کرتے ہوں اللہ کے دوستوں کو دوست رکھتا ہے اور اس کے دشمنوں کو دشمن ایسا ہی شخص ایمانِ کامل کی دولت سے بہرہ ور ہے، جیسا کہ ایمان کے مُعلّم اور ہادیٔ کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں پر اس کی وضاحت فرمائی ہے:-

جس نے اللہ ہی کے لئے محبت کی اور اللہ ہی کے لئے دشمنی، اللہ

ہی کے لئے خرچ کیا اور اللہ ہی کے لئے (خرچ کرنے) سے رک رہا۔

"ایمان کا سب سے مضبوط رشتہ حبّ فی اللہ اور بغض فی اللہ ہے۔"

"تین چیزیں جس کے اندر ہوں گی وہی ایمان کی حلاوت اور لذّت پائے گا (۱) اللہ اور اُس کا رسول ساری کائنات سے زیادہ اس کو محبوب ہوں۔ (۲) جس سے بھی محبّت رکھے صرف اللہ ہی کے لئے رکھے۔ (۳) کفر سے نکل آنے کے بعد اُس کی طرف لوٹ جانے کو اتنا ہی ناپسند کرے جتنا آگ میں پڑنے کو ناپسند کرتا ہے۔"

جب کوئی شخص ایمان کی اس منزل پر پہنچ لے گا تب ہی وہ اپنی پسند اور ناپسند کو اللہ تعالٰی کی رضا اور عدم رضا کے ماتحت کر سکے گا اور اسی وقت کون و مکان کی ہر شئے سے بڑھ کر اللہ اور رسول اس کی نگاہوں میں عزیز ہوں گے اور مخلوق کی محبّت اگر وہ کرے گا تو محض خدا کے لئے نہ کہ کسی دوسری غرض سے۔ اس طرح اس کی یہ محبّتِ خلق بھی محبّتِ خدا ہی کا مقتضا بلکہ اس کا ایک تکمیلی پہلو ہوگی کیونکہ عِشق کا اُصول ہی یہ ہے کہ "ندیم دوست" سے بھی "بوئے دوست" آتی ہے۔ اور محبوب کے محبوب کی محبّت کمال محبت کی نشانی ہے۔

حبّ رسول کی حقیقت | یہیں سے اللہ تعالٰی کے انبیاء اور اولیاء کی محبت کی حقیقت کا بھی سُراغ مل جاتا ہے، ایک شخص جو اِن برگزیدہ بندوں کی محبّت اِس لئے اور محض اسی لئے کرتا ہے کہ وہ حق تعالٰی کے

پسندیدہ طریقوں کے رہبر اور رہنما ہیں، تو گویا اس نے ان کی محبت خدا ہی کے لیے کی، نہ کہ ان کی ذاتی حیثیت سے۔ قرآنِ مجید کہتا ہے:-

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ

(مائدہ - ۸)

تو عنقریب اللہ تعالیٰ کچھ دوسرے لوگوں کو لائے گا جن سے اُس کو محبت ہوگی اور جن کو اس سے محبت ہوگی، مومنوں کیلئے بالکل نرم اور کافروں کے لئے نہایت سخت ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ مومنوں اور خدا پرستوں سے نرمی، اخوت اور محبت کے ساتھ پیش آنا محبتِ خداوندی ہی کا لازمہ اور اسی کا فطری اثر ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(آلِ عمران - ۴)

اے نبی لوگوں سے کہدو کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو پھر میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

اور یہ اس لیے کہ نبی ان کاموں کے کرنے کا حکم دیتا ہے نیز خود انھیں کاموں کو کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور ان کاموں سے روکتا ہے اور خود بھی رُکتا ہے جو اللہ کو ناپسند ہیں اور ایسی حقیقتوں کی خبر دیتا ہے جن سے بنی نوعِ انسان کا باخبر ہونا اور حق کو ماننا اللہ کو محبوب

و مطلوب ہے۔ اس لئے جو مُحبّ خدا ہونے کا ادّعا رکھتا ہو اس کے لئے یہ شرط لازم ہے کہ رسولِ خدا کا اتّباع کرے۔ اس نے غیب و شہود کی جن حقیقتوں کی خبر دی ہو، ان کی تصدیق کرے۔ اس کے ایک ایک حکم کے سامنے بخوشی سرِ تسلیم و اطاعت خم کر دے اور میدانِ زندگی میں اپنا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے رسول کا نقشِ قدم دیکھ لے جس نے ایسا کیا وہ مُحبّتِ الٰہی کے دعوے میں سچا اور امتحان میں کامیاب رہا اور انجامِ کار خدا کی محبوبیت کے شرف سے سرفراز۔

محبّتِ الٰہی کی دو علامتیں اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کو اپنی محبّت کا نشان قرار دیا ہے، (۱) اتباعِ رسول (۲) جہاد فی سبیل اللہ ـــــ جہاد فی سبیل اللہ یعنے خدا کی محبوب چیزوں ـــــ ایمان اور عملِ صالح ـــــ کے حاصل کرنے میں، اور خدا کی ناپسندیدہ چیزوں ـــــ یعنے کفر و فسق اور تمرد و عصیان ـــــ کے مٹا ڈالنے میں اپنی ساری قوتیں اور کوششیں صرف کر ڈالنا ـــــ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (توبہ ـ ۳)۔

اے نبی ان لوگوں سے کہدو کہ اگر تمھارے ماں باپ، بیٹے
بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارے خاندان، تمھارے وہ اموال
جنھیں تم نے کما رکھا ہے تمھاری وہ تجارت جس کے سرد پڑ جانے
کا تمھیں کھٹکا لگا رہتا ہے، اور تمھارے دل پسند مکانات
تمھاری نگاہوں میں اللہ اور اس کے رسول، اور اس کی راہ میں
جہاد کرنے سے زیادہ محبوب (اور قیمتی) ہیں تو پھر ٹھیرو کہ اللہ
اپنا فیصلہ نافذ کرے۔

غور کرو اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو کتنی ہیبتناک وعید سُنائی ہے جو اللہ
اور رسول اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقابلہ میں اپنے اہل اور اپنے
مال کو زیادہ محبوب رکھتا ہے۔ احادیث میں بالکل کھلا ہوا مطالبہ
موجود ہے کہ:۔

"قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری
جان ہے۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ
میں اس کی نظروں میں اُس کے بیٹے اور اُس کے باپ اور تمام
انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"

دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلعم کو
مخاطب کر کے عرض کیا کہ:۔

"یا رسول اللہ! آپ، مجھے اپنی جان کے سوا باقی ہر شئے سے
زیادہ محبوب ہیں۔"

ارشاد ہوا کہ :۔

"نہیں اے عمر! (ایمان کے حقیقی حامل تم نہیں ہو سکتے)

تاوقتیکہ میں تمہیں، تمہاری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"۔

یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ کی فضائے قلب میں ایک برقی انقلاب سا ہوا، پکار اُٹھے "خدا گواہ ہے کہ آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں"۔ فرمایا "ہاں! اب اے عمر!"

پس کمالِ محبت پیدا کرنے کے لئے محبوب سے کامل موالات کا جذبۂ صادق پیدا کرنا ضروری ہے۔ "کامل موالات" کا مطلب یا اس کا معیار یہ ہے کہ اپنی پسند اور ناپسندیدگی اور اپنی محبت اور عداوت کو محبوب کی محبت وعداوت کے ماتحت کر دیا جائے۔ اور یہ معلوم ہی ہے کہ محبوبِ حقیقی ـــــ اللہ تعالیٰ ـــــ کی پسندیدہ چیزیں ایمان اور تقویٰ ہیں اور ناپسندیدہ چیزیں فسق اور عصیان ـــــ نیز یہ ایک معلوم ومشہور حقیقت ہے کہ محبت قلبِ انسانی کا ایک زبردست محرک ہے۔ جب کبھی وہ انسان کے دل میں رسوخ حاصل کرتی ہے، تو اس کو اپنی محبوب چیزوں کے حاصل کرنے پر اُبھارتی رہتی ہے، اگر محبت، حدِ کمال کو پہنچی ہوئی ہے تو محبوب کے حصول کا ارادہ بھی عزم اور حزم کی آخری بلندی پر ہوگا۔ اب اگر بندہ باعتبار اسباب وذرائع اس پر قادر ہو سکتا ہے تو اس کو حاصل کئے بغیر دم نہ لے گا اور اگر عجز ودرماندگی اس کی راہ روک لیتی ہیں اور اپنی انتہائی کاوش کے

باوجود اسے حاصل کرنے سے مجبور اور معذور ہو جاتا ہے تو بھی اُس کو ناکام نہیں کہا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے دربار میں اس کے لئے اتنا ہی اجر ہے جتنا عملاً کامیاب ہو جانے والے اور اس کو کر گزرنے والے کے لئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ :-

جس شخص نے ہدایت کی طرف لوگوں کو بلایا اس کو بھی اتنا ہی اجر ملیگا جتنا اس ہدایت کے ماننے والوں کو ملیگا، اور یہ ان کے اجر میں بغیر کسی کمی کے ہوگا۔ اسی طرح جس نے لوگوں کو گمراہی کی طرف بلایا، اس کو بھی اتنا ہی عذاب ہوگا جتنا اس کا اتباع کرنے والوں پر، اور ایسا ان پیروکاروں کے عذابوں میں بغیر کسی تخفیف کے ہوگا۔

جہاد میں تمنائے شدید رکھنے کے باوجود جو لوگ حصہ لینے سے کسی کسی بناء پر معذور تھے۔ ان کے متعلق فرمایا:-

مدینہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو ہر میدان اور ہر وادی، جس کو تم نے اپنی مجاہدانہ تگ ودو میں طے کیا، تمہارے ہمرکاب تھے۔ صحابہ نے پوچھا "کیا مدینہ میں رہتے ہوئے بھی (وہ ہمارے ساتھ تھے)؟ جواب دیا "مدینہ میں رہتے ہوئے بھی، عذر نے انھیں روک رکھا تھا۔"

جہاد کی حقیقت جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ جہاد نام ہے حق تعالیٰ کی محبوب چیزوں کے حاصل اور برپا کرلے اور اس کی مبغوض اور ناپسندیدہ چیزوں کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے میں اپنی تمام طاقتیں اور کوششیں صرف کر ڈالنے کا۔

حبِ رسول اور محبتِ الٰہی کا معیار پس جہاد ہی در اصل وہ کسوٹی ہے جس پر ہر بندۂ الٰہی کا دعوائے حبِ الٰہی کس کر پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر بندہ طاقت اور قدرت رکھنے کے باوجود، اپنی طاقت کے مطابق فریضۂ جہاد بجا نہیں لاتا۔ تو یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ خدا اور رسول کے ساتھ اس کی محبت اپنے اندر کوئی مضبوط روح نہیں رکھتی بندہ اس فرض کی ادائگی میں اپنی استطاعت کے لحاظ سے جتنی سستی اور بے توجہی دکھائے گا اتنا ہی اپنی محبت کے کھوکھلے پن کا زبانِ حال سے اقرار کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس فرض کی بجا آوری کا راستہ کانٹوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے لیکن محبت کی اس سُنّت کو کون نہیں جانتا کہ محبوب تک رسائی اور باریابی عموماً خطرات اور مصائب اٹھانے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔ محبت صالحہ کی بھی یہی سنت ہے اور یہی محبتِ فاسدہ کی بھی۔ حکومت کا شیدائی تختِ حکومت کو، دولت کا پرستار خزانۂ دولت کو، حسنِ صورت کا دیوانہ وصالِ محبوب کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک اس عالم میں پیش آجانے والے عذابِ شدید کے علاوہ اس دنیا میں بھی ہولناک مصیبتوں سے دوچار نہ ہولے۔ اِس لئے اگر اللہ اور رسول کا مُحِب ان کی محبت کی راہ میں اتنی جانبازی بھی نہ دکھائے۔ جو غیر اللہ سے محبت رکھنے والوں میں سے ایک صاحبِ عقل و عزیمت اپنے محبوب کی خاطر دکھاتا ہے، تو یقیناً وہ اپنی محبّت

کی کمزوری اور سطحیت کی ایک ناقابلِ تردید دلیل دیتا ہے، حالانکہ مومن کی نمایاں صفت یہ ہے کہ ساری کائنات سے زیادہ اس کی اللہ سے محبت ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ - ۲۰)

"اور جو اہلِ ایمان ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبّت رکھتے ہیں۔"

ہاں! ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ محبّت میں صرف جوش اور خلوص ہی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ضمانت نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے ساتھ عقل اور ہوش کی بھی ضرورت ہے ورنہ گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ محبِّ صادق سچی محبت رکھنے کے باوجود، اپنی عقل کی کمی، نظر کی کوتاہی اور تصور کی نارسائی کے باعث ایسی راہ اختیار کر لیتا ہے جس پر چل کر وہ اپنی منزل پر نہیں پہنچتا۔ اور ایسی راہ تو اس وقت بھی مذموم ہوتی ہے جب کہ محبت صالح ہو۔ اور اگر محبتِ فاسد میں کوئی اس طرح کی راہ اختیار کر لے تو پھر اس کی محرومی کا کیا پوچھنا جیسا کہ حکومت، دولت اور صورت کے بعض اندھے دیوانے کیا کرتے ہیں۔ ایک تو ان کی محبت کا رُخ ہی غلط ہوتا ہے، دوسرے اس کے حصول میں عقل و خرد کی تمام ہدایتوں سے آزاد ہو جاتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہاتھ کچھ نہیں لگتا، البتہ طرح طرح کی مصیبتیں اور خواریاں انھیں اپنی آماجگاہ ضرور بنا لیتی ہیں پس راہِ محبت میں سر رشتۂ عقل کا دامن ہاتھ میں رہنا ضروری ہے ورنہ کامیابی سراب ثابت ہوگی

اِس توضیح کے بعد یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ قلبِ انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت جتنی زیادہ ہوتی جائے گی اتنی ہی اس کی عبودیت بھی بڑھتی جائے گی اور وہ ماسوا سے اتنی قدر آزاد اور بے نیاز ہوتا چلا جائے گا۔ علیٰ ہٰذا القیاس جس قدر اس میں عبدیت کا رنگ گہرا ہوتا جائے گا اتنا ہی اللہ کے عشق اور غیر اللہ سے بے نیازی کا نقش پائیدار ہوتا جائے گا۔

قلبِ انسانی کی خصوصیت | انسان فطرۃً اللہ تعالیٰ کی احتیاج محسوس کرتا ہے۔ ایسی احتیاج جس میں عجز اور تذلل کا عنصر بھی شامل ہے اس احتیاج کی دو جہتیں ہیں۔ ایک تو جہتِ عبادت جس کو علّتِ غائی کہنا چاہیے۔ دوسری جہتِ استعانت و توکل جس کو علّتِ فاعلی کہنا چاہیے۔ پس قلبِ انسانی اللہ کی عبادت، محبت اور اس کی طرف انابت کے بغیر نہ تو کبھی حقیقی صلاح و فلاح حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی سچی لذّت اور سُرور کی دولت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے اور نہ سکون خالص اور اطمینانِ صادق کی نعمت سے لُطف اندوز ہو سکتا ہے اس کو دنیا کی ساری نعمتیں اور لذتیں مُیسر کیوں نہ آجائیں لیکن پھر بھی اضطراب کی خلش اس کی گہرائیوں میں موجود ہی رہے گی اور حقیقی سکون و اطمینان کی لذت سے محروم ہی رہے گا، کیونکہ اُس کے اندر محبوبِ حقیقی کی ایک فطری پیاس موجود ہے اور وہ اپنے اندر اپنے پروردگار کی ایک ذاتی احتیاج اور فطری طلب رکھتا ہے۔

اس لئے کہ فی الواقع وہی اس کا اصلی معبود اور محبوب ہے اور اسی کو پاکر وہ صحیح معنوں میں سکون وطمانیت اور لذت وسرور کی شادکامیوں سے متمتع ہو سکتا ہے اور یہ چیز اس کو حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اللہ تعالیٰ ہی اس کی دستگیری نہ کرے۔ اُس کے ماسوا اس پوری کائنات میں کوئی نہیں جو اس کے کام آسکے بس انسان کا قلب دائمی طور پر اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کی روح اور اس کی حقیقت کا فطرۃً محتاج ہے۔ اس لئے اگر اس کے محبوب اور مقصودِ حقیقی کے حصول میں اس کی اِعانت کر بھی دی جائے لیکن عبادتِ الٰہی کا ایسا سچا ذوق اس میں موجود نہ ہو کہ وہی اس طلب وجستجو کا مرکز ومنتہا قرار پا چکا ہو اور اول وآخر اسی کی محبت اُس کا سرمایۂ زندگی بن چکی ہو اور اس کے علاوہ جس کسی سے بھی وہ محبت کرتا ہو، اصالۃً نہ کرتا ہو بلکہ خدا ہی کے لئے کرتا ہو تو اس کیفیت کے ہوتے ہوئے بھی وہ نہ تو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا رمز شناس ہو سکتا نہ توحید عبدیت اور محبتِ الٰہی کے ذروۂ کمال تک اس کی رسائی ہو سکتی ہے اس حالت میں نہ صرف اس میں ایک نقص اور عیب موجود ہوگا بلکہ ہمہ وقت وہ ایک قسم کی بے چینی اور حسرت اور اندرونی خلش محسوس کرتا رہیگا۔

اسی طرح اگر وہ خدا کو اپنا مطلوب حقیقی تو سمجھتا ہو اور اس کے حاصل کرنے کے لئے ریاضتیں بھی کرتا ہو مگر اس سعی وجستجو میں نہ تو خدا ہی سے توفیق طلبی کرتا ہو نہ اس مقصد کے حصول میں اُس کی اِعانتوں کا

خود کو حاجتمند سمجھتا ہو اور نہ اس سلسلہ میں تنہا وہی اس کی امیدوں کا ملجا و ماویٰ ہو تو کبھی بھی گوہر مقصود سے اس کا دامن بھر نہیں سکتا، کیونکہ کسی چیز کا وجود و عدم خدا ہی کی مشیت کے تابع ہے پس انسان دو حیثیتوں سے اللہ جل شانہ کا محتاج ٹھہرا، ایک تو یہ کہ وہی اس کا تنہا اور حقیقی مطلوب اور محبوب و معبود ہے دوسری یہ کہ تنہا وہی اس کا چارہ ساز، پشت پناہ، دست گیر، مرکز آمال اور مرجعِ اعتماد ہے یعنے وہی اس کا "اللہ" ہے جس کے سوا کوئی اس کا معبود نہیں اور پھر وہی اس کا "رب" ہے جس کے سوا کوئی اس کا مالک و آقا نہیں اور عبودیت انسان کی کامل نہیں ہوسکتی جب تک کہ یہ دونوں چیزیں موجود نہ ہوں ورنہ اگر کوئی شخص کسی غیر اللہ کی محبت بالذات کرتا ہے یا اس سے اعانت کی امیدیں وابستہ رکھتا ہے تو در اصل وہ اس محبت اور امید کی مقدار کے مطابق اسی کا بندہ ہے بخلاف اس کے اگر غیر اللہ سے اس کی محبت بالذات نہ ہو بلکہ خدا ہی کے لئے ہو، نیز خدا کے سوا کبھی کسی سے کوئی امید نہ باندھتا ہو اور جن اسباب و ذرائع سے اپنے مقاصد کے حصول میں کام لیتا ہو یا مقاصد کو حاصل کرتا ہو ان کے متعلق پورے شرح صدر کے ساتھ یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے ان اسباب کو پیدا اور مقدر کیا ہے، بجائے خود یہ کوئی قدرت اور تاثیر نہیں رکھتے، نہ کسی اور کے اشارے پر یہ معرضِ وجود میں آئے ہیں، بلکہ اس زمین

کی سطح سے لے کر آسمان کی بلندیوں تک جتنی مخلوقات ہیں سب کا
پروردگار سب کا آقا اور سب کا خالق اللہ ہی ہے اور سب کی سب
بہمہ وجوہ اس کی محتاج ہیں ــــ اگر انسان ان صفات سے آراستہ
ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ اپنی قسمت کے مطابق کمال عبودیت سے
سرفراز ہے۔ اور اس سعادت کے حصول میں لوگوں کے درجے
اس قدر مختلف ہیں کہ ان کا صحیح اندازہ اور شمار اللہ ہی کو معلوم
ہے اور تمام مخلوق میں فضل و کمال عظمت و مکرمت اور ہدایت و
تقرب الٰہی کے لحاظ سے وہی شخص اعلیٰ و افضل ہے جس کی عبدیت مذکورہ
بالا وجوہ سے اعلیٰ و اکمل ہو۔

اسلام کی حقیقت یہی ہے اس دین کی حقیقت جسے اسلام
کہا جاتا ہے اور جس کی تعلیم و تبلیغ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء
کو مبعوث فرمایا اور اپنی کتابیں نازل کیں یعنے یہ کہ بندہ اپنے
آپ کو ہر حیثیت سے خدا ہی کا تابع فرمان بنا دے اور ذرہ برابر
بھی کسی غیر کا فرمانبردار نہ رہے۔ ایسا شخص جو خدا کو بھی اطاعت
کا مستحق سمجھتا ہے اور ساتھ ہی کسی دوسرے کو، وہ مُشرک ہے، اسی
طرح اس کے برعکس جو خدا کی اطاعت و انقیاد کو سرے سے تسلیم
ہی نہیں کرتا وہ متکبر ہے۔

کبر اور عبدیت میں منافات اور کبر کے بارے میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

"یقین رکھو کہ جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہو سکتا جس کے دل میں ذرّہ بھر بھی غرور ہوگا بالکل اسی طرح جس طرح دوزخ میں وہ شخص نہیں جا سکتا جس کے اندر ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا۔" (صحیح بخاری)

گویا معلمِ ایمان کے نزدیک غرور اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں کیونکہ غرور عبودیت کی حقیقت کے بالکل منافی ہے جیسا کہ حدیث قدسی کے الفاظ تبلاتے ہیں :-

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عظمت میری "ازار" ہے اور کبریائی میری "ردا" ہے پس جو شخص ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اس کو سخت سزا دوں گا۔" (صحیح بخاری)

معلوم ہوا کہ عظمت اور کبریائی ربوبیت کے خصائص میں سے ہیں کسی مخلوق کو ان صفاتِ جلالی میں سے کوئی حصّہ بھی نہیں ملا ہے۔ لیکن ان دونوں میں بھی کبریائی کا مقام عظمت سے اونچا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اُسے بمنزلۂ ردا قرار دیا ہے اور عظمت کو بمنزلہ "ازار" کہا ہے۔ رداء ازار سے بلند مقام پر ہوتی ہے۔ یہی راز ہے کہ اذان نماز اور عیدین کا شعار "اللہ اکبر" ٹھیرایا گیا ہے اور ایک مسلمان کے لئے یہ مستحب قرار دیا گیا ہے کہ جب وہ بلند مقامات پر مثلاً صفا و مروہ پر ہو یا کسی اونچائی پر چڑھ رہا ہو یا کسی جانور پر سوار ہو رہا ہو تو تکبیر

کہے اور اللہ جلشانہ کی کبریائی کا اعلان کرے۔ اس تکبیر کا یہ اعجاز ہے کہ اس میں بھڑکتی ہوئی آگ کے بلند سے بلند شعلے سرد پڑ جاتے ہیں اور شیطان اس کو سننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ:۔

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَھَنَّمَ دَاخِرِیْنَ۔

مجھے پکارو میں تمھاری التجائیں سنوں گا۔ یقیناً جو لوگ میری بندگی سے منہ موڑتے ہیں وہ جلد ذلّت کے عالم میں داخلِ جہنم ہونگے"

کبر مستلزم شرک ہی

ہر وہ شخص جو خدا کی بندگی سے استکبار کرتا ہے ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی غیر اللہ کی بندگی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہوگا۔ کیونکہ انسان کوئی بے حس اور جامد شئے نہیں ہی بلکہ وہ فطرۃً ایک حسّاس اور متحرک ہستی ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ "حارث" اور "ہمام" سب سے زیادہ سچے اور ثابت الوجود اسماء یعنے صفاتِ انسانی ہیں" "حارث" کے معنی ہیں کمانے والا اور حرکت و عمل کرنے والا۔ اور "ہمام" کے معنی ہیں ارادہ کرنے والا پس ارادہ انسان کی ایک دائمی صفت ہے جس سے وہ کبھی خالی نہیں ہوسکتا پھر ہر ارادہ کا ایک مقصود اور منتہیٰ پایا جانا بھی ضروری ہے۔ ان دونوں مقدموں کو تسلیم کرنے کے بعد اس امر واقعی سے انکار کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ ہر انسان کا ایک محبوب و مقصود ہونا چاہیئے جو اُس

کی محبتوں کا محور اور ارادوں کا مرکز ہو۔ پس جس شخص کا معبود و محبوب اللہ تعالیٰ نہ ہو وہ خدا کی محبت اور نیازمندی سے اپنے کو برتر اور بے نیاز سمجھتا ہو، لازماً کوئی نہ کوئی غیر اللہ اس کا مراد اور محبوب ضرور ہو گا جو اُس کو اپنا غلام اور بندہ بنائے ہوئے ہو گا، خواہ وہ مال و زر ہو یا شان و شوکت ہو یا حُسن و جمال ہو، یا خدا کے سوا اس کا خود ساختہ کوئی معبود ہو، مثلاً چاند، سُورج، ستارے، مورتیاں، انبیاء و صلحاء کی قبریں وغیرہ یا کوئی نبی یا فرشتہ یا کوئی اور شئے جس کا وہ خدا کو چھوڑ کر پجاری ہو۔ اور جب وہ کسی غیر اللہ کا پرستار بن گیا تو پھر اُس کے مشرک ہونے میں کونسی کسر رہ گئی، معلوم ہوا کہ جو مُستکبر ہو گا مُشرک ضرور ہو گا۔

فرعون کی مثال چنانچہ فرعون کی مثال اس حقیقت کی ایک زندہ شہادت ہے، جو دنیا کا عظیم ترین مُتکبر گزرا ہے لیکن ساتھ ہی مُشرک بھی تھا۔ پہلی چیز یعنے اُس کے استکبار کا ذکر متعدد آیات میں بالتفصیل موجود ہے:۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ .... وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّىْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ .... كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ....

اور فرعون نے کہا مجھے موسیٰ کو قتل کرنے دو اور ذرا اب وہ اپنے رب کو بلائے ...... اور موسیٰ نے کہا کہ میں ہر اس مغرور سے جو حساب کے دن پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے اور تمھارے رب کی پناہ مانگتا ہوں ...... اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر سخت گیر اور متکبر کے دل پر مہر کر دیا کرتا ہے۔"

وَ قَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَ هَامَانَ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَ مَا كَانُوْا سَابِقِيْنَ۔

اور قارون اور فرعون اور ہامان، جن کے پاس موسیٰ روشن دلائل لے کر آئے لیکن انھوں نے (خدا کے ماننے اور اس کی بندگی سے انکار کر دیا اور) دنیا میں کبر و غرور کی روش اختیار کی، حالانکہ وہ ہم سے پیش پانے والے نہ تھے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ

جب اُن کے پاس ہماری نشانیاں بالکل کھلے طور پر آئیں تو اُنھوں نے کہا یہ تو بڑا جادو ہے اور ان کو ماننے سے انھوں نے ظلم اور سرکشی کی بناء پہ انکار کر دیا۔ حالانکہ اُن کے دل اُن کی صداقت پر یقین رکھتے تھے۔ سو دیکھو کہ ان فسادیوں کا انجام کیسا ہوا؟

دوسری چیز پر یعنے یہ کہ فرعون مشرک تھا، یہ آیت گواہ ہے:۔

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ۝

اور فرعون کی قوم میں سے بڑے لوگوں نے فرعون سے کہا کہ آپ موسٰیؑ اور اُس کی قوم کو یوں ہی چھوڑے رہیں گے تاکہ وہ ملک میں فساد انگیزی کریں اور آپ کو اور آپکے معبودوں کو چھوڑ دیں؟

اور نہ صرف یہ کہ ہر مُستکبر مشرک ہوتا ہے بلکہ استقرار اور تجربہ بتلاتا ہے کہ جو شخص خدا کی بندگی اور اطاعت سے جتنا ہی زیادہ سرکشی کرتا ہے اتنا ہی زیادہ پکّا مُشرک ہوتا ہے، کیونکہ عبادتِ الٰہی سے وہ جس قدر زیادہ سرتابی کرتا رہے گا اسی قدر اپنے کسی نہ کسی ایسے مراد و محبوب کا زیادہ محتاج اور نیاز کیش ہوتا جائے گا جو اُس کے دل و دماغ کا مقصودِ اول اور مطلوبِ حقیقی ہو گا۔ اور اس طرح وہ اپنے اِس لات و منات کا اِسی مناسبت سے بندہ بن جائے گا۔ کیونکہ یہ چیز انسان کی جبلّت کے خلاف ہے کہ اُس کا دل اپنا کوئی نہ کوئی مقصود و مطلوب نہ رکھتا ہو، اس لئے جب اصل مقصود یعنے اللہ تعالیٰ کو اس نے اپنے قلب سے نکال پھینکا تو ضرور ہے کہ کوئی دوسری شئے اس خالی جگہ پر قبضہ کر لے ورنہ تمام مخلوقات سے قلبِ انسانی کا خالی اور بے نیاز ہونا اس وقت تک ناممکن ہے

جب تک کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا آقا و مولیٰ نہ بن جائے ۔ ایسا آقا اور مولیٰ جس کے سوا وہ کسی کی عبادت نہ کرے، کسی سے مدد نہ مانگے کسی پر توکل نہ کرے اور صرف اسی چیز سے خوش رہے جو خدا کو محبوب ہو اور اسی شئے کو بری سمجھے جو خدا کے نزدیک مکروہ و مبغوض ہو خدا کے دوستوں کو اپنا دوست سمجھے اور اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن قرار دے، اسی کے لئے محبت کرے اور اسی کے لئے نفرت اسی صفت باطنی کا نام اخلاص دین ہے، یہ اخلاص جتنا زیادہ عمیق اور استوار ہوگا خدا کی عبدیت اتنی ہی زیادہ کامل، اور ماسوا سے بے نیازی اسی قدر مکمل ہوگی، اور عبدیت کا حصول کمال ہی کبر اور شرک کا واحد علاج ہے ۔

یہود و نصاریٰ کی اصلی گمراہیاں ۔ یہی دونوں بیماریاں ہیں جو اہل کتاب میں پیدا ہوگئی تھیں ۔ نصاریٰ پر شرک غالب تھا اور یہودیوں پر کبر ۔ جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے ۔ نصاریٰ کے متعلق فرمایا کہ :-

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔

اِن لوگوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب

بنا لیا ہے خصوصاً مسیح ابن مریم کو۔ حالانکہ انھیں صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں۔ جس کے سوا کوئی دوسرا معبود ہے ہی نہیں۔ پاک و برتر ہے اللہ اس چیز سے جس کو یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں"

یہود کے بارے میں فرمایا کہ:۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ

تو کیا جب کبھی کوئی رسول تمھاری خواہشوں کے خلاف کوئی پیغام لے کر آئے گا تو تم خودسری کروگے۔ چنانچہ اُن میں سے کچھ کو تو تم نے جھٹلا دیا اور کچھ کو قتل کرتے رہے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا

میں اپنی آیتوں (پر ایمان لانے) سے ان لوگوں کو دور ہی رکھوں گا جو زمین میں بغیر کسی استحقاق کے بڑے بنتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ ہر ایک نشانی دیکھ لیں جب بھی ان پر ایمان نہ لائیں گے اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھتے ہیں تو اس کو اپنا راستہ نہیں بناتے

لیکن اگر گمراہی کی راہ دیکھ پائیں تو اس پر چل پڑتے ہیں۔

ہر نبی کا دین اسلام تھا چونکہ کبر شرک کو متلزم ہے اور شرک اسلام کی ضد اور گناہ عظیم ہے جس کی معافی کا بارگاہ احدیت میں حسب اعلان قرآنی، کوئی امکان نہیں، اس لئے ابتدائے آفرینش سے آج تک انبیاء آئے، سب اسی دین "اسلام" کو لے کر آئے۔ اسلئے تنہا یہی وہ دین ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرمایا:-

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔

اگر تم میری بات ماننے سے انکار کرتے ہو (تو جائے تعجب ہے اس میں میرا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) میں تم سے اجر کا طالب نہیں، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے، اور مجھے حکم ہے کہ میں "اسلام" لانے والوں میں سے بنوں۔

ابراہیم علیہ السلام کی دعوت و ارشاد اور طرز عمل کے متعلق قرآن میں ہے کہ:-

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ۝

جب اس کے پروردگار نے اس سے کہا کہ "مسلم" (اطاعت گزار) بن جا تو اُس نے جواب دیا کہ میں نے پروردگار کائنات کے لیئے اپنی گردن جھکا دی اور پھر اُسی امر کی اُس نے اپنے بیٹوں اور یعقوب کو وصیت کی کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمھارے لیئے اِس دین کو پسند فرمایا ہے سو تم مرتے دم تک مُسْلِم (اللہ کے اطاعت گزار) رہنا۔

یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۝

خُدایا! مجھے دنیا سے "مُسْلِم" اٹھا اور نیکو کاروں کے زمرہ میں داخل کر۔

موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کرتے ہیں:۔

یٰقَوْمِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰہِ فَعَلَیْہِ تَوَکَّلُوْٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ ۝

اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم "مسلم" ہو۔

توراۃ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمام انبیاء بنی اسرائیل جو توراۃ کی شریعت کے مبلغ اور پیرو تھے، اُن کا دین بھی اسلام تھا۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىۃَ فِیْھَا ھُدًی وَّ نُوْرٌ یَحْکُمُ بِھَا النَّبِیُّوْنَ

الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا

بلقیس کے سامنے جب صداقت کی تجلی چمکی تو پکار اٹھی:۔

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

مالک! یقیناً میں نے اب تک اپنے اوپر بڑا ہی ظلم کیا، اور اب سلیمان کے ساتھ تمام جہانوں کے پروردگار اللہ کی "مسلم" بنتی ہوں۔

حواریین عیسیٰ کے متعلق اللہ تعالیٰ کہتا ہے:۔

وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝

اور جب میں نے حواریوں کو وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو انھوں نے جواب دیا ہم ایمان لائے اور اے خدا تو گواہ رہ کہ ہم "مسلم" ہیں۔

قرآن حکیم کی ان تصریحات سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہر پیغمبر کا دین اسلام تھا یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کا یہ اعلان ہے کہ اسلام کی شاہراہ ہی وہ تنہا شاہراہ ہے جو میری بارگاہ مقبولیت تک پہنچاتی ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۝

بے شک دین تو اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ

اور جس شخص نے اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین اختیار کیا اس کا دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

اسلام دین کائنات ہے نہ صرف یہ کہ ہر نبی اسلام لے کر آیا اور تمام بنی آدم کا یہی دین رہا ہے بلکہ اسلام ساری کائنات کا دین ہے قرآن کہتا ہے۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کو چھوڑ کر کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے، چار ونا چار اسی کے سامنے سرفگندہ ہے

"طَوْعًا وَّكَرْهًا" کی قید کل کائنات کے "اسلام" میں اس وجہ سے لگائی ہے کہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی مکمل تابع اور زیر فرمان ہیں خواہ کوئی اس فرمانبرداری کا اقرار کرے یا نہ کرے، نیز تمام لوگ اس کے سامنے عاجز محض ہیں اور اس کے دست تصرف وتدبیر میں ہیں اس کے فرامین مشیت اور احکام تدبیر سے یک سرمو انحراف کسی کے لئے ممکن ہی نہیں اس لئے چار ونا چار سب اسی کے مسلم اور مطیع ومنقاد ہیں، ساری طاقتوں اور قدرتوں

کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے، ایک ذرہ سے لے کر آفتاب تک ہر چھوٹی بڑی چیز کا پروردگار وہی ہے، جس طرح چاہتا ہے ان میں بلا روک تصرف کرتا رہتا ہے، سب کا پیدا کرنے والا سب کو وجود بخشنے والا اور سب کی صورتیں بنانے والا وہی ہے، اس جہانِ ہستی میں اس کے سوا جو کچھ ہے سب کا سب مخلوق ہے، مربوب ہے، محتاج ہے، فقیر ہے، غلام ہے، مجبور ہے، مقہور ہے اور ہر حیثیت سے مسخر ہے اور وہی اکیلا ہر شے کا خالق اور مصور ہے۔ اگرچہ جس چیز کو بھی اس نے پیدا کیا ہے، اسباب کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن ان اسباب کا خالق اور صاحبِ تقدیر بھی وہی ہے، اس لئے وہ اسباب بھی اسی طرح اس کے محتاج ہیں۔ اور اس عالمِ کون و فساد کوئی سبب بھی اپنی تاثیر میں مستقل بالذات نہیں ہے بلکہ ہر سبب ایک دوسرے سبب کا دست نگر ہوتا ہے جس کی اعانت کے بغیر وہ اپنا فعل اور اثر ظاہر نہیں کرسکتا۔ یہ سبب یعنی علت العلل ذاتِ باری تعالیٰ ہے جو اسباب و علل سے مافوق اور ہر شے سے بے نیاز ہے جس کا نہ تو کوئی شریک ہے کہ اس کی اعانت کرے نہ کوئی مدمقابل ہے جو میدان مقابلہ میں اس کے سامنے آئے:۔

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ

رَحْمَتِهٖ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ

اے نبی ان سے کہو کہ کیا تم نے ان کے حال پر کچھ غور کیا جن کو خدا کو چھوڑ کر تم پوجتے ہو؟ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا یہ اس کے نقصان کو دور کر سکتی ہیں؟ یا خدا مجھ پر کوئی رحمت کرنی چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکتی ہیں؟ کہہ دو کہ اللہ میرے لئے کافی ہے اسی پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔

اس طرح کی بے شمار آیتیں قرآن میں موجود ہیں، جو شہادت دیتی ہیں کہ ہر فعل اور ہر سبب فعل کی باگ ڈور مشیت الٰہی کے ہاتھوں میں ہے حضرت ابراہیم خلیل نے اپنی قوم کی کٹ حجتیوں اور دھمکیوں کے جواب میں اسی حقیقت نایاں کو پیش فرمایا تھا کہ "میں تمھارے شریک ٹھیرائے ہوئے معبودانِ باطل سے ڈرنے والا نہیں، ہاں اگر میرے پروردگار ہی کی مشیت کچھ اس قسم کی ہو تو اور بات ہے۔"

ابراہیم خلیل عبدیت کاملہ کا نمونہ عبدیت کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم ایک امتیازی شان اور اسوہ کمال رکھتے ہیں، خدا کی ساری زمین دین شرک کی ظلمتوں سے تاریک ہو رہی تھی کہ توحید، عبودیت اور اخلاص کا یہ نورانی پیکر حق پرستوں اور مخلصوں کا امام بن کر نمودار ہوا جس کی عبدیت کاملہ کا خود معبود کو اعتراف ہے :-

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ- قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ-

اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور اس نے ان کو پورا کر دیا تو پروردگار نے فرمایا کہ میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ ابراہیم نے کہا اور میری اولاد میں سے؟ جواب ملا کہ میرا وعدہ ظالموں کے لئے نہیں۔

دیکھو یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے غیر مبہم طریقہ پر اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ یہ وعدۂ امامت صرف مومنوں اور حدود عبدیت کی حفاظت کرنے والوں کے لئے ہے ظالموں اور حدود الٰہی سے تجاوز کرنے والوں کے لئے نہیں ہے۔ اور سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ- پس ظالموں اور مشرکوں کو یہ رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز کئے جائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامتِ اقوام کا شرف کمالِ عبودیت کی آزمائش میں کامیاب ثابت ہونے پر ملا تھا چنانچہ آپ کو خدا پرستی کا اسوہ اور پیشوا قرار دیا گیا اور آپ کی نسل کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی نعمتِ عظمیٰ سے نوازا۔ اور آپ کے بعد جو نبی بھی مبعوث ہوا آپ ہی کی ملت پر مبعوث ہوا۔ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا۔ (اے نبی یکسو ہو کر ملتِ ابراہیمی کی پیروی کر)۔ دوسری جگہ یہود و نصاریٰ کی

نسبت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو یہودیت و نصرانیت کی گروہ بندی سے کوئی علاقہ نہیں، اللہ تعالیٰ کی ہدایت تو ملتِ ابراہیمی کی پیروی میں ہے۔ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا۔

حدیث میں حضرت ابراہیم کی شان میں فرمایا گیا ہے کہ "ابراہیم خیر البریہ ہیں" معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ تمام مخلوق اور سارے انبیاء سے افضل ہیں چنانچہ دربارِ خداوندی سے آپ کو "خلیل اللہ" کا خطاب عطا ہوا ہے جس سے بڑا دی عزت خطاب کوئی نہیں۔

خُلّت کا مفہوم اس امر کی دلیل کہ "خلیل" سے بڑھ کر کوئی خطاب نہیں، خود "خلیل" اور "خُلت" کے الفاظ کی تہوں میں پوشیدہ ہے خُلّت نام ہے بندہ کی خدا کے ساتھ انتہائی محبت کا جو کمال عبودیت کو مستلزم ہو۔ نیز بندہ کے ساتھ خدا کی اس کامل محبت کا جو بندے کے لئے اس کی کامل ربوبیت کو لازم ہو۔ اور لفظ "عبودیت" جیسا کہ آغاز بحث میں تفصیل کے ساتھ تبلایا جا چکا ہے، انتہائی تذلل اور انتہائی محبت کے مجموعہ کا نام ہے۔ پس مقام خُلّت و محبت کے مقام سے بلند تر ہوا اور یہی وہ اعلیٰ کمال ہے جو حضرت ابراہیم اور حضرت محمد علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کے دربار سے مرحمت ہوا تھا اور یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا، اس زمین پر بسنے والوں میں سے کوئی خلیل نہ تھا، جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ "اگر میں اہل

ارشاد ہے۔ "کسی کو اپنا خلیل منتخب کرتا تو وہ ابوبکرؓ ہوتے لیکن میں تو اللہ تعالیٰ کا خلیل ہو چکا ہوں"۔ معلوم ہوا کہ انسان کسی ایک ہی کا خلیل بن سکتا ہے اور خلّت قابلِ شرکت چیز نہیں، خلّت کے مفہوم کو کسی نکتہ دان شاعر نے کس خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے۔

قد تخللت مسلک الروح منی وبذا سمی الخلیل خلیلا

(میری محبوبہ میری روح کے ایک ایک ریشہ میں "تخلل پذیر" ہو گئی ہے (یعنی چھا گئی ہے) اسی وجہ سے خلیل کو خلیل کہتے ہیں)۔

محبّت اور خلّت میں فرق محبت اور خلت میں یہی فرق و امتیاز ہے کہ خلت شرکتِ غیر کی متحمل اور روادار نہیں لیکن محبت میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ خلت صرف ایک سے ہو سکتی ہے اور محبت ایک کے سوا دوسروں سے بھی ہو سکتی ہے چنانچہ رسول اکرم صلعم نے اللہ تعالیٰ سے رشتۂ خلت رکھنے کے باعث کسی ماسوا کو اپنا خلیل بنانے سے انکار فرمایا، مگر اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے کے باوجود بہت سے لوگوں کو اپنا حبیب قرار دیا مثلاً حضرت حسنؓ اور حضرت اسامہؓ کے متعلق فرمایا کہ "خدایا! میں ان سے محبت رکھتا ہوں سو تو بھی ان سے محبت رکھ"۔ اسی طرح عورتوں میں سے حضرت عائشہؓ اور مردوں میں سے حضرت ابوبکرؓ کو آپ نے اپنا سب سے بڑھ کر محبوب قرار دیا۔ کلام رسول کے بعد کلام الٰہی پر نظر ڈالئے تو جگہ جگہ دکھائی پڑتا ہے کہ "اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے"۔ "اللہ محسنوں

سے محبت رکھتا ہے"۔ "اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے"۔ "اللہ ایسے لوگوں کو لائے گا جن کو وہ محبوب رکھتا ہوگا اور جو اُس کو محبوب رکھتے ہوں گے"۔ گویا اللہ تعالیٰ بتانا چاہتا ہے کہ سچے مومن وہ ہوتے ہیں جن سے خدا محبت رکھتا ہے

اور جو خدا سے محبت رکھتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا۔ "ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہوتے ہیں"۔ جس سے ثابت ہوا کہ مومن صالح اگرچہ سب سے زیادہ خدا ہی سے محبت رکھتا ہے مگر دوسروں سے بھی محبت رکھ سکتا ہے جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ محبت میں وحدت ضروری نہیں۔ بخلاف خلت کے۔

ایک خیال عام کی تردید عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حبیب تھے اور حضرت ابراہیمؑ اللہ کے خلیل تھے، اور یہ کہ محبت کا مقام خلت کے مقام سے مافوق ہے۔ لیکن یہ خیال کوئی مضبوط بنیاد نہیں رکھتا۔ کیونکہ احادیث صحیحہ سے یہ اچھی طرح ثابت ہے کہ آنحضرت بھی خلیل اللہ تھے صحیح بخاری اور مسلم دونوں میں یہ روایت موجود ہے اور مختلف طرق واسانید کے ساتھ موجود ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا خلیل بنایا ہے جیسا کہ ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تھا"۔

ایک دوسری حدیث اوپر گذر چکی ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ میں اللہ کا خلیل ہو چکا ہوں اور اب کسی اور کو خلیل بنانے کا موقع و محل باقی نہیں رہا۔

لذّت اور حلاوتِ ایمانی یہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ محبّت الٰہی سے مراد یہ ہے کہ ان چیزوں سے محبت کی جائے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں۔ محبتِ الٰہی کی یہ تاویل ہم نے نصوصِ شرعیہ کی روشنی میں کی ہے۔ اس سلسلہ میں صحیحین کی مذکورہ بالا حدیث کے پُر حکمت الفاظ پر دوبارہ غور کیجیے جس میں فرمایا گیا ہے کہ "تین چیزیں ہیں کہ جس کسی کے اندر یہ تینوں موجود ہوں گی وہی حلاوتِ ایمانی سے شاد کام ہوگا .... الخ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز سے لذّت یابی اُس کی محبّت کے بعد ہوتی ہے۔ یعنے اگر ایک شخص کسی چیز کی محبت و آرزو رکھتا ہے تو جس وقت وہ چیز اس کو حاصل ہوتی ہے وہ ایک کیفیت، ایک حلاوت، ایک لذّت اور ایک سرور محسوس کرتا ہے۔ اور لذت اس خاص کیفیت کا نام ہے جو کسی موافق طبع شئے یعنے کسی مرغوب و محبوب شئے کے ادراک اور حصول کے بعد پیدا ہوتی ہے اور بعض خام کار فلسفیوں اور طبیبوں کا یہ خیال کہ لذت شئے مرغوب کے تعقل اور ادراک و حصول ہی کا نام ہے، ایسا پھسپھسا اور بے اصل ہے کہ جس کی تردید کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ یہ "ادراک اور حصول" تو رغبت اور لذت کی بیچ کی کڑی ہے

نہ کہ نفس لذت۔ مثال کے طور پر کھانے کا مسئلہ لیجئے۔ کھانا انسان کی ایک مرغوب چیز ہے اور جب وہ اس کھانے کو کھا لیتا ہے تو ایک لذت محسوس کرتا ہے پھر یہ کہنا کس قدر غلط ہے کہ کھانا کھانا ہی لذت ہے۔ اسی طرح قوتِ باصرہ کو لیجئے، جب انسان کسی محبوب شئے کی طرف دیکھتا ہے تو دیکھنے کے بعد اس سے لذت پاتا ہے معلوم ہوا کہ لذت کا حصول دیکھنے اور نظر ڈالنے کے بعد ہوتا ہے اس لئے نظر اور چیز ہوئی اور لذت اور چیز جو نظر کے بعد وجود میں آتی ہے۔ قرآن کے الفاظ بھی اسی حقیقت کی شہادت دیتے ہیں:۔

وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ

اور اس بہشت میں وہ نعمتیں ہیں جن کی دلوں کو آرزو ہوگی اور جن سے آنکھیں لذت گیر ہوں گی۔

معلوم ہوا کہ نفس نظر اور رویت کا نام لذت نہیں ہے ورنہ یوں نہ فرمایا جاتا کہ "آنکھیں اُن کو دیکھ کر لذت گیر ہوں گی۔"

یہی حال تمام احساسات نفس کا ہے، نفس کو جو خوشی یا غم وغیرہ کیفیات لذت و الم محسوس ہوتی ہیں وہ کسی نہ کسی شئے محبوب یا امر مکروہ کے شعور و ادراک کا نتیجہ ہوتی ہیں، نہ کہ نفس شعور و ادراک ہیں۔ ایمان کی حلاوت اور پھر اس کے ساتھ لذت و سرور کا حصول خدا کے ساتھ کامل محبت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور یہ مقام تین چیزیں دل میں پورا اُترنے کے بعد ہاتھ آتا ہے۔ ایک تو اس محبت کی تکمیل، دوسری اس محبت

کی تفریع تیسری اُس محبت کی ضد ہے نفرت اور موافقت تکمیل محبت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول ساری موجودات سے زیادہ محبوب ہوں، کیونکہ جیسا کہ پہلے گذر چکا۔ اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے باب میں صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ فی الجملہ ان سے محبت رکھی جائے۔ بلکہ یہ ضروری ہے کہ ان کی محبت سب سے زیادہ ہو۔ اور تفریع محبت کا مدعا یہ ہے کہ اگر بندہ کسی انسان کی محبت کرے تو وہ محبت بھی لِلّٰہ ہو بالاصل نہ ہو۔ اور دفع ضد کا مفہوم یہ ہے ضد ایمان ــــــ کفر و شرک ــــــ کو آگ میں پڑنے سے بڑھ کر ناپسندیدہ تر سمجھے۔

جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ رسولِ خدا اور مومنوں کی محبت بھی دراصل خدا کی محبت ہے یعنی اسی کا ایک جز یا پرتو ہے اور رسولِ خدا صلعم ان مومنوں سے محبت رکھتے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے انعام سے سرفراز کیا تھا، اور اسی وجہ سے رسول کو ان سے محبت تھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ محبت تھی اس لئے لازماً اللہ کے محبوبوں کی محبت اور اس کے مبغوضوں کا بغض بھی آپ کے قلبِ مبارک میں سب سے زیادہ ہونا ہی چاہیئے تھا لیکن محبت کے بالمقابل خلّت کا حال دیکھئے کہ کس طرح اس میں غیر اللہ کے لئے ایک شمّہ بھی حصہ نہیں نہ اصالتاً نہ تبعاً، بلکہ وہ اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے جس سے محبت مطلق پر خُلّت کی

فضیلت روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے۔

محبت الٰہی کے مفہوم میں افراط و تفریط۔ خلاصۂ کلام یہ کہ خدا کی محبت اور خلت ہی میں عبودیتِ الٰہی حقیقت پوشیدہ ہے لیکن کتنے ہی اہلِ علم و نظر ایسے ہیں جو اس حقیقت سے دور جا پڑے۔ ان کا گمان ہے کہ عبودیت تو صرف تذلل اور خضوع کا ایک خشک وظیفہ ہے، اس میں محبت کی چاشنی کہاں؟ محبت تو ایک کی قلبی تمناؤں کی انبساطی کیفیت کا اور دوسرے کی طرف سے ناز و انداز کے اظہار کا نام ہے، اور ربوبیت اس قسم کی چیزوں سے ماوراء ہے، پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک محبوب یا محب کی حیثیت دی جائے لیکن یہ غلط اندیشی محبت الٰہی کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ذوالنونِ مصری کے سامنے محبتِ الٰہی کا ذکر چھڑ گیا تو آپ نے فرمایا کہ "خاموش رہو، اس مسئلہ پر گفتگو مت کیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ عام لوگوں کے کانوں تک یہ بات پہنچے اور وہ محبتِ الٰہی کا ادعا کرنے لگیں۔" چنانچہ بعض علماء نے ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا مکروہ قرار دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی خشیت ذکر و تصور کئے بغیر صرف اس کی محبت کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس معاملہ میں ایک بزرگ کا قول لوحِ دل پر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے جنھوں نے فرمایا کہ "جو شخص خدا کی عبادت صرف محبت کے ساتھ کرتا ہے وہ زندیق ہے اور جو صرف رجا کے ساتھ کرتا ہے وہ مرجی ہے اور جو صرف خوف کے ساتھ کرتا ہے وہ

ضروری ہے۔ مومن موحد وہ ہے جس نے خدا کی عبادت، محبت و خوف اور رجاء تینوں کے ساتھ کی۔ واقعات اس حکیمانہ نکتہ کی گواہی دے رہے ہیں صوفیائے متاخرین میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جنھوں نے دعوائے محبت میں حدود کو فراموش کر دیا، آپے سے باہر نکل گئے یہاں تک کہ ان میں ایک طرح کی رعونت پیدا ہو گئی اور وہ ایسے دعوے کر بیٹھے جو عبدیت کے منافی ہیں اور جن میں ایسی شانِ پروردگارانہ پائی جاتی ہے جو اللہ جل مجدہٗ کے سوا کسی کے شایانِ شان نہیں، انھوں نے اپنے کو اس مقام پر ظاہر کیا جو نبوت و رسالت کے مقام سے بھی بالاتر ہے اور اپنے لئے خدا کی ایسی صفات کا مطالبہ کر گئے جو خدا ہی کے لئے مخصوص ہیں اور جو انبیاء و رسل کے لئے بھی موزوں نہیں۔

یہ وہ خطرناک غلطی ہے جس کے شیطانی جال نے بڑے بڑے شیوخ طریقت کو شکار کر لیا۔ اس کا سبب عبودیت کی حقیقت تک فہم کی نارسائی اور تحقیق عبادت کی کمی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کا باعث اس عقل کی کوتاہی ہے جس کے بغیر ایک بندہ اپنی حقیقت پہچان نہیں سکتا۔ پس جب عقل خام کار ہوتی ہے اور دین کا علم پوری طرح حاصل نہیں رہتا تو ایسی حالت میں اگر نفس میں محبت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں تو نفس اپنی نادانی کے باعث اپنے آپ سے باہر ہو جاتا ہے اس کو اپنی حدود یاد نہیں رہتیں جیسا کہ عشق مجازی میں انسانی

فطرت کا مشاہدہ ہم جب چاہیں کر سکتے ہیں۔ پھر جب نفس اس فریب شیطانی کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کی زبان سے بڑے بول نکلنے لگتے ہیں، وہ علانیہ کہنے لگتا ہے کہ میں تو عاشقِ خدا ہوں، میں جو چاہوں کروں، مجھ پر کوئی گرفت نہیں۔ لیکن یہ اصلی اور کھلی ہوئی گمراہی ہے اور بالکل وہی بات ہے جو یہود اور نصاریٰ کی زبانوں سے نکلی تھی کہ "ہم تو خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں"۔ اور جس کا جواب خدا نے یہ دیا کہ تم اس کے بیٹے اور پیارے ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہو، مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ تمھیں عذاب پہ عذاب کیوں دیا کرتا ہے کیا ابنیت اور محبوبیت کی یہی علامتیں ہیں؟ پس یہ نفس کا ایک خطرناک فریب ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جو اللہ کا محبوب ہوتا ہے اس کو وہ صرف ایسے ہی کاموں میں لگاتا ہے جو اس کی رضا کے موجب ہوں، وہ کبھی ایسے کام نہیں کرتا جو اس کی ناراضی کا سبب ہوں اور جو کبائر کا ارتکاب کرتا ہے اور نافرمانی پر نافرمانیاں کرتا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ان افعالِ بد کو اسی طرح نفرت اور غصہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس طرح اس کے اعمالِ نیک کو قدر و محبت کی نظر سے، کیونکہ خدا کسی بندے سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنا کہ اس میں ایمان اور تقویٰ ہے۔

اور اس شخص کی مثال، جو گمان کرتا ہے کہ محبوبِ خدا ہونے کے باعث اس کو گناہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اس خوش فہم کی سی ہے جو سمجھتا ہو کہ چونکہ میرا امزاج معتدل اور میری صحتِ جسمانی بالکل ٹھیک

ہے، اس لئے خواہ میں کتنا ہی زہر کیوں نہ کھا لوں اور پھر مسلسل کیوں نہ کھاتا رہوں لیکن اس سے میرا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ اگر یہ عقل کا دشمن قرآن پر نظر ڈالتا اور انبیائے کرام کے احوال و قصص کو تدبر کی نگاہ سے دیکھتا کہ کس طرح نوعِ انسانی کے ان سرتاجوں کو بھی کبھی کبھی توبہ و استغفار کی ضرورت پیش آہی گئی اور خدا کے ان محبوب ترین بندوں کو بھی اپنے اپنے حالات کے مطابق، تزکیہ نفس کی خاطر ابتلاؤں اور مصیبتوں کی بھٹی سے گزرنا ہی پڑا، تو اُسے معلوم ہو جاتا کہ گناہ کے نقصانات اپنی ضرر رسانی میں کتنے مستعد اور اپنی اثر اندازی میں کتنے بے رحم واقع ہوئے ہیں کہ کسی بڑے سے بڑے مقرب بندہ کو بھی نہیں بخشتے۔ پھر یہ بات بھی عین مقتضائے فطرت ہے خود انسان انسان کے تعلقات میں اس اصول کی کارفرمائی مشاہدہ کی جاسکتی ہے ایک وجود انسانی کا عاشق اگر اپنے محبوب کی مرضی اور مصلحت سے واقف نہ ہو اور اس کے مطابق طریق کار اختیار نہ کرے بلکہ صرف اپنے جذبات عشق کے اشاروں پہ رقص کرتا رہے تو بالیقین اس کا یہ رویہ اپنے محبوب کی نفرت اور ناراضی کا، بلکہ عداوت اور تعذیب تک کا موجب ہو جاتا ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کتنے ہی اہلِ سلوک ایسے گزرے ہیں جو محبتِ الٰہی کے زعم میں طرح طرح کی خلافِ دین باتیں کہہ اور کر گئے۔ کہیں تو حدود اللہ کی پاسداری فراموش کر دی گئی، کہیں حقوق اللہ کو پسِ پشت،

ڈال دیا گیا اور کہیں بے سرو پا اور باطل دعاوی کر دیے گئے
کوئی صاحب فرما گئے کہ "میرے جس کسی مرید نے ایک شخص کو
دوزخ میں رہنے دیا، اس سے میں بری ہوں"۔ کسی نے اعلان
کیا کہ "جس کسی مرید نے ایک مومن کو بھی دوزخ میں جانے دیا
میں اس سے بیزار ہوں"۔ ایک تیسرے صاحب سنا گئے کہ قیامت کے دن
میرا خیمہ جہنم کے دروازے پر نصب رہے گا تاکہ ایک شخص بھی اس کے
اندر داخل نہ ہونے پائے"۔ یہ اور اسی طرح کے بے شمار اقوال بعض مشہور و
معروف مشائخ کی بابت بیان کئے جاتے ہیں جو یا تو ان بزرگوں پر بہتان
اور افترائے محض ہیں یا اگر انھیں کے اقوال ہیں تو یقیناً وہ سخت
غلط ہیں جو ہوش کی باتیں نہیں بلکہ حالتِ سُکر یا غلبہ یا فنا کی
باتیں ہیں جس میں انسان ہوش اور تمیز کھو بیٹھتا ہے یا کم از کم اس
کی تمیز اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ وہ نہیں جان سکتا کہ میرے منہ سے
کیا نکل رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے
حالتِ خاص کے زائل ہونے اور ہوش و تمیز بجا ہو جانے کے بعد
اس قسم کی باتوں سے توبہ و استغفار کیا یہی صورت حال ان صوفیا
کے بارے میں بھی پیش آئی ہے جنھوں نے عشقیہ قصائد سننے میں اپنے لئے گنجائش پیدا کی۔

ان لغزشوں کا علاج اور محبّت کا معیار

عشق و محبت کی راہ کے یہی وہ خطرات اور مزلات تھے جن سے بچانے کے لئے
اللہ تعالیٰ نے محبت کی ایک کسوٹی مقرر فرما دی ہے تاکہ ہر مدعی

کا دعوائے محبت اس پر پرکھ کر دیکھا جا سکے، فرمایا:۔

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ

اگر تم واقعی خدا سے محبت رکھنے والے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا

گویا وہی شخص خدا کی محبت کا سچا دعویدار کہا جا سکتا ہے جو اس کے رسول کے ایک ایک نقش قدم کو اپنا اسوہ بنائے اور یہ حقیقت کسی بحث یا تشریح کی محتاج نہیں کہ رسول کی اطاعت و قیادت ہی تحقیقِ عبودیت کا دوسرا نام ہے پھر قرآن نے ایک قدم آگے بڑھا کر حب الٰہی اور حبِ رسول کا ایک اور نمایاں معیار مقرر فرما دیا ہے اور وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ جہاد کے معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ماموراتِ سے انتہائی شیفتگی اور اس کے منہیات سے مکمل نفرت۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان خاص بندوں کا جو اس کے محبوب ہیں اور جن کا وہ محبوب ہے نشانِ امتیاز یہ قرار دیا ہے کہ:۔

اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔

وہ مومنوں کے سامنے نہایت فروتن ہوتے ہیں لیکن کافروں کے لئے نہایت سخت اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس امت کی محبت اور عبودیت امم سابقہ کے مقابلہ میں زیادہ کامل و اکمل ہے اور اس امت کے اندر اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

بہ نسبت اور لوگوں کے زیادہ کامل ہیں یا پھر وہ لوگ جو اصحاب رسول کا سچا نمونہ بن جائیں۔ جو اُن سے جتنی ہی زیادہ عملی ہمرنگی پیدا کرلے گا اتنا ہی زیادہ کامِل العبودیت ہوگا۔

ایک طرف محبتِ الٰہی کا یہ معیار اور نمونۂ عمل سامنے رکھیئے، پھر ان لوگوں کے اقوال اور کردار پر نظر ڈالیئے جو اپنے کو خدا کی محبت کا اور اس کی محبوبیت کا اجارہ دار سمجھتے ہیں، حالانکہ رسول کی سنت اور اس کی اطاعت کی دن رات دھجیاں اُڑاتے رہتے ہیں اور ایسے عقائد و تصورات رکھتے ہیں جو دین و شریعت کی بنیاد ہی ڈھا دیتے ہیں۔

پس اتّباعِ شریعت اور جہاد فی سبیل اللہ ہی وہ سب سے بڑا فرق و امتیاز ہے جو خدا کے سچے عاشقوں اور غلط کار مدعیوں کے درمیان پایا جاتا ہے جس کے ذریعہ ان اولیاء اللہ کے جو واقعتہً خدا کے محب اور محبوب ہیں، اور اِن مدعیانِ محبّت کے درمیان تمیز کی جاسکتی ہے جو دعوائے محبت کے ساتھ مخالفِ شرع امور یعنی اپنے جی کی گھڑی ہوئی بدعات کا اتباع کرتے رہتے ہیں یا محبت کا یہ خود ساختہ مفہوم لیتے ہیں کہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز سے مُحبّت کی جائے حتیٰ کہ کفر و فسق و عصیان جیسی چیزوں سے بھی۔

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہی وہ خطرناک غلط فہمی تھی جس نے یہود اور نصاریٰ کو ڈبو دیا۔ اِن نام نہاد "صُوفیائے" اسلام کا

دعوائے محبت بھی نہیں اہلِ کتاب کے ادعائے محبت کی طرح کا ہے جو کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے لاڈلے ہیں۔ گو اس لحاظ سے کہ اِن کا کفر اُن کے کفر کی حد تک نہیں پہنچا ہے۔ انھیں یہود و نصاریٰ کے برابر گمراہ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اگر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو ان کا دعویٰ اُن یہودیوں اور نصرانیوں کے دعوے سے بھی بدتر اور مہلک تر ہے کیونکہ اس کے اندر مخالفت شرع کے ساتھ ساتھ نفاق کے جرائم بھی موجود ہیں اور معلوم ہے کہ منافقین کا مستقر دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوگا۔

محبتِ الٰہی کی تعلیم توراۃ اور انجیل میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح قرآن میں۔ اور اِن کتابوں کے الفاظ و عبارات اور اصل تعلیمات کے بارے میں خود ان کے پیروں کے درمیان شدید اختلافات ہونے کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ محبتِ الٰہی کی تعلیم کے اصل ہونے میں کسی گروہ کو اختلاف نہیں۔ بلکہ یہ تعلیم ان کے یہاں "ناموس" کی سب سے بڑی اور بنیادی وصیت تسلیم کی جاتی ہے۔ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا، مسیح کی سب سے بڑی وصیت یہ ہے کہ تو خداوند کی محبت کر، اپنے پورے قلب اور اپنی پوری عقل اور اپنی پوری روح کے ساتھ چنانچہ آج بھی نصاریٰ کو اس امر کا دعویٰ ہے کہ وہ اس حُبِّ الٰہی پر قائم ہیں اور ان کے اندر جو زہد اور عبادت پائی جاتی ہے وہ اسی وصیت کا اثر ہے۔ لیکن واقعہ کیا ہے؟ واقعہ یہ ہے

کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے بالکل تہی دامن ہو چکے ہیں کیونکہ وہ ان چیزوں پر عمل نہیں کرتے جو خدا کو پسند ہیں بلکہ ان چیزوں پر عمل کرتے ہیں جو خدا کو مبغوض ہیں، انھیں رضائے الٰہی کی پرواہی نہیں جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے سارے اعمال حبط کر دیے ہیں۔ ادھر وہ محبوبیت کے نشہ میں مست ادھر اللہ تعالیٰ انھیں اپنے باغیوں اور ملعونوں کی فہرست میں شامل کر چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنا محبوب اور موردِ لطف و کرم رکھتا ہے جو فی الحقیقت اس کے مُحب ہوں، پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ بندہ تو خدا سے محبت رکھتا ہو اور خدا کو کوئی محبت نہ ہو! بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خدا سے بندے کو جتنی محبت ہوتی ہے، خدا کو بھی اتنی ہی محبت اس سے ہوتی ہے اور عنایت مزید یہ ہوتی ہے کہ اس کا اجر اُس کی بہ نسبت کہیں زیادہ دیتا ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے کہ:-

"جو شخص میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ قریب آتا ہے میں اس کی طرف ایک گز قریب ہو جاتا ہوں اور جو میری طرف پیدل آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔"

قرآن کو دیکھئے تو قدم قدم پہ یہ الفاظ ملتے ہیں "اللہ متقیوں سے محبت رکھتا ہے"۔ "اللہ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے" "اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے" وغیرہ۔ نہ صرف یہ کہ بلکہ نصوص

تو یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں لوگوں کو اپنی محبوبیت کی سند فخر عطا فرماتا ہے جو واجبات سے گزر کر نوافل پر کثرت سے عمل کرنے لگتے ہیں مشہور حدیث قدسی ہے :۔

> "بندہ نوافل کے ذریعہ میرے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں ہی اُس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے......الخ

اہل زہد وریاضت کی خام خیالیاں۔

اللہ تعالیٰ کی محبوبیت اور محبت کا یہ معیار اسلامی نگاہ میں رکھئے اور اس کے بعد ایسے برخود غلط "زہاد" کے مزعومات پر نظر ڈالئے جو زہد وعبادت کی چند مخصوص چیزوں پر تندہی کے ساتھ عمل پیرا رہتے ہیں مگر کتنے ہی امور ایسے ہیں جن میں وہ شریعت کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں مجاہدہ کرنے کا تصور تک نہیں رکھتے مگر اس کے باوجود ــــ مخالفتِ شرع اور ترکِ جہاد کے باوجود ــــ خدا کی محبت کے مدعی ہیں۔ اور بعض ویسی ہی خام خیالیوں میں مبتلا ہیں جس میں نصاریٰ مبتلا تھے یہ لوگ اپنے اس محدود تصور دین کے اثبات میں اسی قسم کی باتوں سے حجت پیش کرتے ہیں جن کی نصاریٰ نے آڑ لی ہے یعنی یا تو قرآن وحدیث کے متشابہ الفاظ کی حسب خواہش تاویلیں کرتے ہیں، یا پھر ایسے اقوال وحکایات پر اپنے استدلال کی عمارت

اٹھاتے ہیں جن کے قائل کی صداقت اور حق پسندی کا ثبوت نہیں اور اگر بربنائے حسنِ ظن اس کی صداقت شعاری تسلیم ہی کر لی جائے تو بھی اس امرِ واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ معصوم نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اس کی باتوں کو وحیٔ آسمانی کی طرح واجب الاتباع مانتے ہیں جس کا دوسرے لفظوں میں یہ مطلب ہوا کہ جس طرح نصاریٰ نے اپنے علماء اور مشائخ کو شارعین دین کا مقام دے رکھا تھا یہ لوگ بھی اپنے مرشدوں اور پیشواؤں کو دراصل اپنا شارع دین سمجھتے ہیں اور انجام کار نوبت یہاں تک بھی پہنچ جاتی ہے کہ عبودیت کی جڑ پر آرہ چلا دیتے ہیں اور یہ دعوی کرنے لگتے ہیں کہ خواص عبدیت کی حدود پار کر جاتے ہیں جیسا کہ عیسائی حضرت مسیح کے بارے میں دعوی کرتے ہیں حالانکہ دینِ حق تو نام ہے اللہ تعالیٰ کی کامل و مکمل عبدیت کی تحقیق کا اور عبدیت کاملہ عبارت ہے اللہ عز و جل کی انتہائی اور ہمہ گیر محبت سے ایک کی کمی دوسری شئے کی کمی کا ثبوت ہے اور غیر اللہ کی محبت دراصل اس کی عبدیت کا اور غیر اللہ کی عبدیت فی الحقیقت اس کی محبت کا نشان ہے غیر اللہ کی محبت ــــ اگر اللہ ہی کے لئے نہ ہو تو وہ ــــ جبینِ حق کا داغ ہے، اور جس عمل کا ہدف رضائے الٰہی نہ ہو سامانِ حسرت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایمان کی نگاہ میں یہ دنیا و مافیہا سب کا سب ملعون ہے سوا اس کے جو اللہ ہی کے لئے ہو، اور اللہ کے لئے وہی شئے ہو سکتی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہو اور اللہ

اور رسول اللہ کی پسندیدہ چیز وہی ہے جس کی رسول نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعہ تعلیم دی ہے۔ پس جو عمل خدا کے لئے نہ ہو وہ بھی مردود (انما الاعمال بالنیات الخ) اور جو عمل اسوۂ رسول کے مطابق نہ ہو وہ بھی مردود (من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فھو رد)۔

یہی دین اسلام کی بنیاد ہے، یہ بنیاد جتنی مستحکم اور استوار ہوگی اتنی ہی دین کی حقیقت کا وجود ہوگا۔ یہی مقصد تھا آسمانی کتابوں کے نزول کا اور یہی غایت تھی انبیاء کرام کی بعثت کی اسی کا آخری داعی اسلام نے بھی پیغام سنایا، اسی کے لئے اس نے اپنے جسم و روح کی ساری قوتیں وقف کر رکھی تھیں۔

آفات نفس (شرک) اس مقام عبدیت تک پہنچنے میں نفس انسانی کی بعض زبردست کمزوریاں روگ بن جاتی ہیں، ان میں سب سے بڑی اور بنیادی شئے میلانِ شرک ہے۔ شرک نفس انسانی کی ایک غالب اور قاہر بیماری ہے، یہاں تک کہ اس امت میں بھی اس کے مخفی جراثیم پائے جاتے ہیں جو توحید کی تنہا علمبردار ہے اور اس کی خبر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ چنانچہ صحابۂ کرام اس سے محفوظ رہنے کی فکر سے کبھی غافل نہیں رہتے تھے حضرت صدیق اکبرؓ نے پیغمبر صلعم سے پوچھا کہ "جب شرک پاؤں کی آہٹ سے بھی زیادہ مخفی ہوتا ہے (جیسا کہ حضور فرماتے ہیں) تو بھلا ہم اس کے

حملہ سے کیونکر بچ سکتے ہیں"۔ ارشاد ہوا کہ "آؤ میں ایک ایسا کلمۂ شفا بتاؤں جو تمہیں ہر چھوٹے بڑے شرک سے محفوظ رکھے گا، تم خدا سے دُعا کیا کرو کہ:۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ اَنْ اُشْرِکَ بِکَ وَاَنَا اَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُکَ لِمَا لَا اَعْلَمُ ہ

خدایا! میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ جان بوجھ کر تیرا ساجھی ٹھہراؤں اور اس شرک سے تیری مغفرت چاہتا ہوں جس کا مجھے علم نہ ہو"۔

حضرت عمرؓ دعا مانگا کرتے تھے کہ:۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ عَمَلِیْ کُلَّہٗ صَالِحًا وَاجْعَلْہُ لِوَجْھِکَ خَالِصًا وَلَا تَجْعَلْ لِاَحَدٍ فِیْہِ شَیْئًا ہ

اے اللہ میرے ہر عمل کو صالح اور اپنے ہی لئے خالص بنا اور اس میں کسی اور کا کوئی حصہ نہ بنا۔

حبّ جاہ و مال نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ عموماً نفس انسانی پر ایسی مخفی آرزوئیں چھائی رہتی ہیں جو خدا کی حقیقی محبّت و بندگی اور اخلاص کے پودے کو پروان چڑھنے نہیں دیتیں۔ شداد بن اوسؓ نے اہلِ عرب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "اے اہلِ عرب! مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ جس چیز کا خوف ہے وہ ریا اور شہوتِ خفیہ (یعنی جاہ وحشمت کی خواہش) ہے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

اس عظیم ترین مہلکۂ ایمانی سے ان لفظوں میں متنبہ کیا ہے :-

"دو ایسے بھوکے بھیڑیئے جو بکریوں کے کسی باڑے میں
چھوڑ دیے جائیں ان بکریوں کے لئے اتنے خطرناک نہیں جتنی
مال اور جاہ کی حرص دین و ایمان کے لئے خطرناک ہے" (ترمذی)

معلوم ہوا کہ جس سینہ میں سچا اور صحیح دین ہوگا اس میں حرص مال و جاہ کا وجود ممکن نہیں جس کا سبب یہ ہے کہ جب دل محبت اور عبودیت الٰہی کا مزہ پالیتا ہے تو پھر اس کی نگاہ میں کوئی شئے اس سے بڑھ کر مرغوب نہیں رہ جاتی کہ وہ اس کی طرف مائل ہو سکے۔ یہی وہ چیز ہے جو اہلِ اخلاص کے لئے برائیوں اور بدکاریوں سے محفوظ رہنے کا ذریعہ بنتی ہے جیسا کہ قرآنِ کریم سے مترشح ہوتا:-

كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوٓءَ وَالْفَحْشَآءَ
إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ ۝

"اسی طرح تاکہ ہم یوسف سے برائی اور بے حیائی کو دور
رکھیں یقیناً وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا"

اس کی وجہ یہ ہے کہ بندۂ مخلص محبتِ الٰہی اور خدا پرستی کا وہ ذوق رکھتا ہے جو اس کو غیر خدا کی محبت اور بندگی سے روک دیتا ہے کیونکہ اس کے دل کے لئے کوئی شئے ایمان سے زیادہ شیریں لذیذ خوش آئند اور پرکشش نہیں رہ جاتی اور یہ کیفیتِ باطن تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف کھینچ اٹھے اور پھر ہمہ دم اسی کی طرف

جُھکا رہے، اسی کے ذکر میں مشغول، اسی کے خوف سے لرزاں اور
اسی کی نوازشوں کا امید وار رہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ
مُّنِیْبٍ ...... الخ

جو غیب میں خدائے رحمٰن سے ڈرتا رہا اور اس کے حضور جذبۂ
انابت سے بھرا ہوا دل لے کر حاضر ہوا ...... الخ۔

یہ اس لئے کہ محبت کا فطری اقتضا ہی یہی ہے کہ محب اگر ایک
طرف وصال محبوب کی امیدوں سے سرشار ہوتا ہے تو ساتھ ہی
حصولِ مراد کی ناکامیوں کے تصور سے مضطرب بھی رہتا ہے، یہی
وجہ ہے کہ خدا کا بندہ اور اُس کا محب ہمیشہ خوف اور رجا کے مشترکہ
یا متضاد جذبات محسوس کرتا ہے یَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ
عَذَابَهٗ کے الفاظ اسی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔

اس کے بالمقابل اس شخص کو لو جو اس دولتِ اخلاص سے
بے بہرہ ہے طلب وارادہ اور محبتِ مطلق تو بہرحال اس کے دل
میں بھی ہو گی کہ طلب ومحبت انسانی فطرت کے لوازم میں سے ہے
لیکن جس طرح ایک کمزور شاخ ہوا کے ہر اشارے پر جھک جانے
کے لئے تیار ہو جاتی ہے، بعینہٖ اسی طرح ایسا آدمی بھی نور اخلاص سے
محرومی کے باعث کسی بھی دروازے پر جھک سکتا ہے اور اپنے
اس جذبۂ محبت کو جس آستانہ پر چاہے بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔

کبھی حسن صورت پر ریجھتا ہے تو ایسے ایسے پست اور ذلیل انسانوں کا غلام بن کر رہ جاتا ہے جو عام حالات میں خود اس کی غلامی کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔ اور کبھی شوقِ نمود اور تمنائے ریاست کا دیوانہ بن جاتا ہے تو ذرا سی بات پر مگن ہو جاتا ہے اور معمولی سی بات پر آپے سے باہر، خوشامدیوں کا غلام بن جاتا ہے، اگرچہ وہ اس کی کتنی ہی جھوٹی تعریف کریں اور ملامت گروں کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے اگرچہ ان کی ملامت کتنی ہی مبنی برصداقت کیوں نہ ہو۔ اور کبھی مال و دولت کا حلقہ عبدیت اپنی گردن میں ڈال لیتا ہے غرضیکہ جو دل فریب چیز بھی سامنے آ گئی اس نے اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دیا۔ انجام کار اس کی خواہشِ نفس ہی اُس کا معبود ہو جاتی ہے، پھر زندگی کا جو قدم بھی وہ اٹھاتا ہے ہدایتِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر ہی اٹھاتا ہے۔

نفسِ انسانی کی یہی دو حالتیں ہو سکتی ہیں یا تو وہ اللہ واحد کا محض پرستار ہو یا پھر مخلوقات کا بندہ ہو کر رہے اور مختلف قسم کے شیاطین اس کے دل و دماغ پر چھا جائیں۔ تیسری کوئی راہ نہیں ہے کیونکہ قلب انسانی اگر ما سوا سے کٹ کر اللہ واحد کا گرویدہ نہیں ہے تو شرک کی نجاستوں سے اس کا آلودہ ہونا ایک امر یقینی ہے قرآن مجید جس ایمان کا مطالبہ کرتا ہے اس کی حقیقت اس سے ذرا بھی مختلف یا کم نہیں ہے فرماتا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا .... پس تو اپنے رُخ کو یکسو کر، دین اسلام کی طرف سیدھا کر۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ..... یہی فطری دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ .... اسی کی طرف جھکتے ہوئے اور اس سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔"

تمام بنی نوعِ انسان انہی دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک تو حنیف و مخلص بندوں کا گروہ جو خدا ہی کی محبّت اور عبودیت اور مخلصانہ طاعت کا علمبردار ہے۔ دوسرا مشرکین کا گروہ جو ہوائے نفس کا پرستار ہے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم اور آلِ ابراہیم کو پہلے گروہ کا امام قرار دیا ہے جس طرح اس نے فرعون اور آل فرعون کو دوسرے گروہ کا پیشوا قرار دیا ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا .... الخ

اور ہم نے ابراہیم کو بخشے اسحٰق اور یعقوب بطور عطیہ اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا اور ہم نے ان کو امام بنایا"

جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔
فرعون اور آلِ فرعون کے متعلق فرمایا:۔

وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ...... الآیہ

اور ہم نے ان کو (گمراہی کا) لیڈر بنایا جو لوگوں کو آگ کی طرف بلاتے تھے"

فتنۂ وحدۃ الوجود اس گروہِ فرعونی کی ضلالت کی ابتدا اس غلط نظریہ سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور قضا، مرضی اور مشیت دونوں ایک چیز ہیں، اور انتہا اس کفر خالص پر ہوتی ہے کہ خالق اور مخلوق دونوں ایک ہی شئے ہیں۔ جو خالق ہے وہی مخلوق ہے اور جو مخلوق ہے وہی خالق ہے۔ ان کو یہ اصرار ہے کہ مخلوق بھی خالق کی ہم پلہ ہے۔ حالانکہ ابراہیم کا اعلان یہ ہے کہ "تم اور تمھارے گمراہ آبا و اجداد نے جن چیزوں کو معبود بنا رکھا ہے وہ سب کے سب ماسوا پروردگار عالم کے میرے دشمن ہیں اَفَرَاَیْتُمْ مَّا کُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمُ الْاَقْدَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، ان لوگوں کے مسلک کی بنیاد بعض مشائخ کے متشابہ اقوال پر ہے۔ یہ غریب ابتغاءِ تاویل اور زیغِ قلب و نظر کی اسی بیماری میں مبتلا ہو گئے جس کے شکار نصاریٰ ہو گئے تھے

فنا ان متشابہ اقوال میں سے مثال کے طور پر ایک مشہور عام لفظ کو لے لو اور دیکھو کہ اس ایک لفظ کے پردہ میں کیسے کیسے خطرناک اور سراپا الحاد فتنے چھپے ہوئے ہیں۔

فنا کے تین درجے ہیں۔ ایک درجہ تو وہ ہے جو انبیائے کرام اور اولیائے کاملین کو حاصل تھا، دوسرا درجہ عام صلحائے امت اور کم مرتبہ اولیاء کا ہے۔ تیسرا درجہ منافقوں اور ملحدوں کا ہے۔

پہلے درجہ کی حقیقت یہ ہے کہ عابد کی نگاہ میں اللہ کے سوا ہر شئے بے حقیقت ہو کر رہ جائے، خدا ہی سے محبت ہو، اسی کی بندگی ہو، اسی پر بھروسہ ہو اور اسی سے ہر طرح کی مدد چاہی جائے۔ بندگی کا کمال یہ ہے کہ بندہ وہی پسند کرے جو خدا کو پسند ہو اور اسی چیز سے محبت رکھے جو خدا کو محبوب ہے مثلاً ملائکہ، انبیاء اور صلحاء۔ جس دل پر یہ حالت طاری ہو جائے اس کو قرآن نے "قلب سلیم" کہا ہے۔ سلیم کے معنی ہیں محفوظ، قلب سلیم وہ قلب ہے جو ماسوائے اللہ سے یا ماسوائے عبادتِ الٰہی سے یا ماسوائے مرادِ الٰہی سے یا ماسوائے محبتِ الٰہی سے پاک اور محفوظ ہو۔ خدا کی محبت اور بندگی کے اس مقام کو آپ فنا کے لفظ سے تعبیر کریں یا کسی اور لفظ سے، ہمیں اس سے چنداں بحث نہیں ہے، البتہ یہ حقیقت ہے کہ اصلی اسلام یہی ہے۔

دوسری قسم فنا کی یہ ہے کہ ماسوا کے شہود سے قلب یکسر بے نیاز ہو جائے، اکثر سالک اسی کیفیت میں رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

ان کے دل خدا کی محبت، عبادت اور اس کے ذکر کی طرف پوری طرح کھنچ اُٹھتے ہیں اور چونکہ دل کمزور ہوتے ہیں اس وجہ سے جلال و جمالِ خداوندی سے ایسے مرعوب و متحیر ہو جاتے ہیں کہ ان میں اتنی قوت باقی نہیں رہ جاتی کہ ماسوا کو دیکھ سکیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر اللہ کا ان کے دلوں میں سرے سے گزر ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کا احساس تک کھو بیٹھتے ہیں یہی کیفیت قلبی تھی ام موسیٰ کی جب حضرت موسیٰ کو موجوں کے دوش پر بحکم الٰہی سوار کرایا گیا اور جس کے متعلق قرآن نے فرمایا ہے کہ:-

وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَارِغًا ...... الآیہ

موسیٰ کی ماں کا دل "خالی" ہو گیا۔

"خالی ہو گیا" یعنے موسیٰ کے ذکر و فکر کے سوا ہر شئے سے خالی ہو گیا۔ اس میں صرف موسیٰ ہی موسیٰ رہ گئے۔ یہ کیفیت ایسے اشخاص پر بالعموم طاری ہو جایا کرتی ہے جن کو محبت یا خوف یا رجا کے کسی غیر معمولی جذبہ سے یکایک سامنا ہو جاتا ہے اس وقت ان کے دل میں اُس شئے کے سوا جس سے محبت یا خوف یا رجا کا جذبہ وابستہ ہے کسی اور چیز کا تصور نہیں راہ پاتا۔ پس ذکر الٰہی میں بھی اس صورت حال کا پیش آنا ایک امر واقعہ ہے، اور جب کسی ذاکر کو یہ مرحلہ پیش آجاتا ہے اس وقت من و توکی تمیز اُٹھ جاتی ہے، وہ اپنے محبوب کو پاکر خود اپنے وجود سے غافل ہو جاتا ہے اور اپنے مشہود میں محو ہو کر اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھتا ہے، اس کی نگاہِ باطن صرف ایک ذات ازلی و حقیقی یعنے

اللہ تعالیٰ ہی کو موجود پاتی ہے اور باقی ساری کائنات اس کیلئے فنا ہو جاتی ہے۔ جب یہ کیفیت شدت و قوت اختیار کر لیتی ہے اور ساتھ ہی سالک کا دل اتنا کمزور بھی ہوتا ہے کہ من و تو کے امتیاز میں حیران سا رہ جاتا ہے تو اس کے ذہن پر یہ گمان مستولی ہو جاتا ہے کہ وہی آپ اپنا محبوب ہے۔

یہ وہ مقام ہے جس کی تمیز اور معرفت میں کتنی ہی قوموں نے ٹھوکریں کھا کر اپنے آپ کو گمراہی کے گڑھے میں ڈال دیا انھوں نے اس کیفیت کو "اتحاد" سمجھ لیا یعنے یہ کہ یہ وہ مقام ہے جہاں عاشق اپنے محبوب میں مل جاتا ہے اور پھر ان دونوں کے وجود میں کوئی فرق، کوئی غیریت اور کوئی دوئی نہیں رہ جاتی بلکہ دونوں مل کر ایک وجود ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ صریح غلطی اور نادانی ہے کیونکہ خالق کے ساتھ کوئی چیز بھی متحد نہیں ہو سکتی اور خالق کیا، کوئی چیز بھی کسی دوسری چیز کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتی سوائے اس کے کہ وہ دونوں اپنی ماہیت سے دست کش ہو جائیں یا ان میں فساد رونما ہو جائے یا ان دونوں کے ملنے سے ایک تیسری شئے پیدا ہو جائے جو ان دونوں میں سے ہر ایک سے مبائن حقیقت رکھتی ہو جس طرح پانی اور دودھ یا پانی اور شراب مل کر ایک تیسری شئے بن جاتے ہیں کہ پھر نہ اُسے پانی کہہ سکتے ہیں نہ دودھ نہ شراب اور ظاہر ہے کہ ذات باری کے متعلق ان میں سے کسی صورت اتحاد کا تصو

نہیں کیا جا سکتا، اس لئے عاشقِ خدا اور خدا کا متحد ہونا ایک امر ناممکن ہے۔ ان دونوں کی مراد اور مرضی ہیں، اتحاد ہو سکتا ہے ان کی پسند اور ناپسند میں یکسانی ہو سکتی ہے جو چیز محبوب کو بھلی معلوم ہو اس کو بھی بھلی لگے اور جس چیز سے محبوب کو نفرت ہو اس کو بھی نفرت ہو، جس کو محبوب دوست رکھتا ہو اس کو وہ بھی دوست رکھے اور جس کو محبوب دشمن رکھتا ہو اس کو وہ بھی دشمن سمجھے۔ یہی اتحاد ممکن ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہی اور صرف یہی اتحاد ہوتا بھی ہے۔

فنا کی یہ نوعیت اپنے اندر گوناگوں نقائص رکھتی ہے اور اولیائے کاملین مثلاً حضرت ابوبکر و عمر و دیگر اکابر مہاجرین و انصارِ سابقین میں سے کوئی بھی اس میں نہیں پڑا، اور انبیائے کرام کا تو ذکر ہی کیا۔ فنا کی یہ قسم صحابہ کے بعد عالمِ وجود میں آئی کیونکہ اس فنا کا مولد و منشا، دراصل ضعفِ قلب ہے اور صحابہ کے قلوب وارداتِ ایمانی کا تحمل کرنے میں اتنے کامل، اتنے قوی اور اتنے ثابت و ضابط تھے کہ کسی حال میں بھی ان کی عقلیں معطل نہ ہوتی تھیں، نہ ان پر کوئی ضعف طاری ہوتا تھا نہ کوئی سکر نہ کبھی ان پر عشق کی حیرانی طاری ہوتی، نہ وجد و حال کی وارفتگی ان باتوں کی ابتدا تو بصرہ کے تابعین سے ہوئی ہے سب سے پہلے یہیں یہ بات دیکھنے میں آئی کہ بعض لوگوں نے قرآن سنا

اور اس کے جلال کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے اور بعض کی اسی عالم میں روح ہی پرواز کر گئی۔ مثلاً ابو جہیر اور زرارہ بن اوفیٰ قاضی شہر۔ پھر یہ سلسلہ آگے چلا اور شیوخ صوفیہ میں سے بھی ایسے لوگ گزرے جن پر فنا اور سکر کی ایسی کیفیت طاری ہوئی جس نے ان کی قوتِ تمیز کو ناکارہ کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ اسی عالمِ مدہوشی میں ایسی باتیں کہہ گئے جن کی غلطی کا، در ستگی حواس کے بعد انھوں نے خود اعتراف کیا جیسا کہ حضرت ابو یزیدؒ ابو الحسنؒ اور ابو بکر شبلیؒ وغیرہ بزرگوں کی بابت بیان کیا جاتا ہے۔ ان کے برخلاف حضرت ابو سلمان دارانی، معروف کرخی، فضیل بن عیاض اور حضرت جنید وغیرہ جن کے قلوب مضبوط تھے اور جن کے قوائے عقل و تمیز ہر حال میں بحال رہتے تھے، کبھی اس کیفیت میں مبتلا نہ ہوئے۔ محبت و بندگی کا حقیقی کمال یہی ہے جو لوگ اس نعمتِ کمال سے بہرہ ور ہوتے ہیں ان کی فضائے عقل میں خدا کی محبت، عبادت اور طلب کے سوا کسی غیر شئے کا گزر نہیں ہوتا مگر اس کے ساتھ ہی وہ علم اور وہ قوتِ تمیز ان کے ساتھ رہتی ہے جو انھیں تمام امور اور اشیاء کا ان کی اصلی صورت میں مشاہدہ کراتی رہتی ہے۔ وہ اپنی بصیرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ ہی کے امر و حکم سے قائم ہے اور اسی کی مشیت ان سب کی مدبر ہے، پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کے سامنے یہ رازِ فطرت

بے نقاب ہو جاتا ہے کہ ساری کائنات اللہ جلّ مجدہٗ کے سامنے سر فگندہ اور اس کی تسبیح میں مشغول ہے۔ یہ مشاہدہ ان کے لئے بڑی عبرت و موعظت کا سبب بن جاتا ہے اور ان کے اخلاص دینی، عبادتِ الٰہی اور خالص خدا پرستی کے جذبات کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے۔

قرآن جس حقیقت عبودیت کی طرف بلاتا ہے وہ یہی ہے سچے مومنوں اور کامل عارفوں نے جن کے سرتاج ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اسی عبودیت کو اختیار کیا چنانچہ جب شبِ معراج میں آپ آسمانوں پر تشریف لے گئے اور وہاں آیاتِ الٰہی کا آپ نے نظارہ فرمایا اور پھر عبد و معبود میں ناقابلِ فہم و بیان راز و نیاز ہوئے۔ تو باوجودیکہ یہ قربِ الٰہی کا وہ مقام تھا جو کسی کو بھی نصیب نہ ہوا مگر آپ کی حالت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ نہ کسی قسم کی خود فراموشی طاری ہوئی اور نہ آپ کی عقل و تمیز معطل ہوئی بخلاف موسیٰ علیہ السلام کے کہ طور پر تجلیٔ رب کا عکس دیکھنے کی بھی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو گئے۔

فنا کی تیسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود دکھائی نہ پڑے اور خالق کا وجود ہی عین مخلوقات کا وجود قرار پا جائے گویا عبد اور معبود میں کوئی فرق نہ رہ جائے۔ فنا کی یہ تعریف اُن گمراہوں اور ملحدوں کے نزدیک ہے جو حلول اور اتحاد کے قعرِ ضلالت میں جا گرے۔

کلامِ مشائخ کی صحیح تاویل

اہلِ حق و معرفت شیوخ نے جو اس قسم کے جملے کہے ہیں کہ "ما اری غیر اللہ" یا "لا انظر الی غیر اللہ" وغیر ذالک تو ان کی مراد ان اقوال سے یہ ہے کہ "میں اللہ کے سوا کسی کو کائنات کا پروردگار یا خالق یا مدبر یا الٰہ نہیں دیکھتا۔ اور میں کسی غیر کی طرف محبّت یا خوف یا امید کی نگاہیں نہیں ڈالتا"۔ کیونکہ انسان کی نگاہ اسی چیز کی طرف اٹھتی ہے جو اس کے دل میں کوئی جگہ رکھتی ہو جس سے اس کو کوئی محبت یا خوف ہو، ورنہ جس چیز سے نہ اس کو کوئی محبت ہو، نہ کوئی عداوت نہ کوئی طمع ہو نہ کوئی خوف اس کی طرف اس کا دل کبھی متوجہ نہ ہو گا اور اگر کبھی اس کی نگاہ "اتفاقاً" پڑے گی بھی تو بالکل اسی طرح جیسے راہ چلتے کسی اینٹ پتھر پر پڑ جایا کرتی ہے بس یہ ایک حقیقت ہے اور نہایت قابلِ ستائش حقیقت ہے کہ بزرگانِ دین مخلوقات پر اسی حیثیت سے نظر ڈالتے تھے اور ان کے اقوالِ مذکورہ کا یہی مدعا ہے۔ وہ ان جملوں میں توحید اور اخلاص کی اس کامل اور بے آمیز حقیقت کا اعلان فرماتے ہیں کہ بندہ کو غیر اللہ کی طرف التفات نہ کرنا چاہیئے۔ اور نہ کسی ماسوا کی طرف محبت یا خوف یا رجا کی آنکھ اٹھانی چاہیئے بلکہ اس کے دل کو تمام مخلوق کے ذکر و فکر سے خالی اور بے نیاز ہونا چاہیئے اور جب کبھی ان کی طرف دیکھے اللہ کے نور کے ساتھ دیکھے۔ یعنے حق کے کانوں سے سنے حق کی نظروں سے دیکھے۔ حق کے ہاتھوں سے پکڑے حق کے پاؤں سے

چلے، اس کائنات کی انہی چیزوں سے محبت رکھے جن سے خدا کو
محبت ہو اور ان سے نفرت کرے جن سے خدا کو نفرت ہو۔ اس
دنیا کو برتنے میں اللہ سے ڈرتا ہے اور اللہ کی رضا کے معاملہ میں
ساری مخلوق کی مخالفتوں اور عداوتوں سے بے خطر ہو۔ یہی وہ
دل ہے جو سلیم اور حنیف ہے جس کو عارف و موحد کہا گیا ہے اور جس کو
مومن و مسلم کا خطاب زیب دیتا ہے جس طرح فنا کی تیسری قسم یعنی
فنا فی الوجود فرعون اور اس کے اتباع مثلاً قرامطہ وغیرہ کی تحقیق
ہے اسی طرح کی یہ قسم انبیائے کرام اور ان کے اتباع صالحین کے
مخصوصات میں سے ہے۔ اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اللہ
تعالیٰ کے نزدیک محمود ہے جتنے سچے اور قابلِ اتباع مشائخ گذرے
ہیں سب کا اللہ رب السموات والارض کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد
تھا کہ وہ ساری مخلوق سے بالکل الگ اور مبائن ہستی ہے۔ وہ قدیم
ہے اور باقی ساری موجودات حادث ہیں اور اس ذاتِ قدیم کا تمام
اشیائے حادث سے الگ اور منفرد ہونا ایک امر ضروری ہے۔ انھوں نے
راہِ سلوک میں پیش آنے والے امراض و شبہات قلب سے بھی پوری
طرح باخبر کر دیا ہے کہ بعض لوگ سلوک باطن کے دوران میں مشاہدہ
تو مخلوقات کا کرتے ہیں لیکن ہیں قوتِ تمیز کے فقدان کے باعث
انھیں کو خالق گمان کر بیٹھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ایک آدمی
سورج کی شعاعوں کو دیکھ کر یہ گمان کر بیٹھے کہ یہی سورج ہیں حالانکہ

حقیقت یہ نہیں ہوتی۔

وَحدۃ الشّہود فنا کی اصطلاح سے ملتی جلتی "فرق اور جمع" کی اصطلاحیں بھی ہیں اور ان میں بھی اسی قسم کے خطرناک رسوم عبادت اور تصورات داخل ہو گئے ہیں جو فنا کی اصطلاح میں موجود ہیں۔ ایک بندہ جب مخلوقات کی گوناگونی کثرت پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کی نگاہ اور اس کا قلب دونوں ہی ان میں الجھ کر رہ جاتے ہیں، وہ مختلف چیزوں کو سامنے پاتا ہے اس نے مختلف سمتوں میں اس کی نظریں اٹکی رہتی ہیں۔ کہیں شوق و محبت کی بنا، پر کہیں خوف کی بناء پر اور کہیں امید کی بناء پر۔ پھر قلب و نظر کے اضطراب اور تفرق کے بعد جب اس کو "جمع" کا منبع اطمینان ہاتھ آجاتا ہے تو اس کی آوارگی نظر جمعیت سے بدل جاتی ہے اور اس کا دل خدا کی وحدانیت اور عبودیت پر آکر جم جاتا ہے۔ اس وقت اُس کی محبت، استعانت خوف، رجا اور توکل کے سارے احساسات اسی ایک ذات والا صفات پر آکر مرتکز ہو جاتے ہیں ایسی حالت استغراق میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اُس کے قلب کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ مخلوقات کی طرف بھی دیکھ سکے تاکہ خالق اور مخلوق میں امتیاز کرے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قلب مرکز حق پر معتکف ہو جاتا ہے اور خلق سے بالقصد توجہ پھیر لیتا ہے۔ یہ فنا کی قسم ثانی سے بالکل مشابہ کیفیت ہے اور ضعف قلب کا نتیجہ ہے۔

اِس کے بعد "جمع" کی ایک دوسری قسم آتی ہے۔ وہ یہ کہ ذاتِ باری تعالیٰ پر دل سے یکسوئی کے ساتھ جم جانے کے باوجود اس کو یہ دکھائی دیتا ہو کہ تمام کائنات اللہ ہی کی قدرت سے قائم اور اسی کے حکیم تدبیر سے مصروفِ عمل ہے اور یہ کہ مخلوقات کی ساری کثرت اور گوناگونی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں گم اور معدوم ہے اور یہ کہ اللہ ہی ساری مخلوق کا پروردگار، معبود، خالق اور مالک ہے۔ ایسا دل ایک طرف تو اخلاص و محبت، خوف و رجا، توکل و استعانت، حبّ للہ اور بغض للہ کے جذباتِ ملکوتی سے لبریز اور ذاتِ خداوندی پر مجتمع رہتا ہے اور دوسری طرف خالق اور مخلوق کا فرق و امتیاز بھی اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے پاتا یہی سچی عبدیت ہے اور یہی کلمۂ طیبہ کی صحیح روح ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کا عملی مفہوم اس کے سوا کچھ ہے ہی نہیں کیونکہ یہ چیز قلب میں غیر اللہ کی معبودیت کا کوئی دھندلا سا نشان بھی نہیں چھوڑتی اور حق تعالیٰ کی الٰہیت کا عمیق اور ہمہ گیر نقش اس پر بٹھا دیتی ہے گویا ہر ایک مخلوق کی معبودیت کی نفی، اللہ رب العالمین کی معبودیت کا کامل اور لازوال اثبات کر دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل اسی ایک ذات پر آکر مجتمع ہو جاتا ہے اور غیر اللہ سے اضطراب انگیز تعلقات سے بالکل کنارہ کش ہو کر رہ جاتا ہے، پھر اس کی تمام تر توجہات کا مرکز اللہ ہی رہتا ہے اور اس کے

ذکر و فکر، عشق و محبت، تعظیم و عبادت، طلب و رضا و اطاعت امر اور خوف و رجا کے جذبات اسی ایک کعبۂ مقصود کے طواف میں مشغول رہتے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ ایک لمحے کے لئے بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کرتا کہ مخلوقاتِ عالم واقعہ میں اپنا الگ اور مستقل وجود رکھتی ہیں، ایسا وجود جو وجود باری تعالیٰ سے یکسر مبائن ہے۔

اس مقام تک پہنچ جانے کے بعد وہ صحیح معنوں میں موحد بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس رازِ توحید کی طرف ان احادیث سے کھلی ہوئی رہنمائی ہوتی ہے جن میں فرمایا گیا ہے کہ "سب سے افضل ذکر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ ہے۔

ذکر الٰہی کے بدعی اور غیر مشروع طریقے

بدقسمتی سے لوگوں نے یہاں بھی کجیٔ ذہن کے نہایت خطرناک مظاہرے کئے ہیں اور اتنے واضح ارشاد کے باوجود یہ گمان کر بیٹھے کہ لا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا ذکر محض عوام کے لئے ہے، اور خواص کا طریقۂ ذکر یہ ہے کہ صرف لفظ "اللہ" کا ورد کیا جائے اور خاص الخواص کو اس لفظ کے اظہار کی بھی ضرورت نہیں، ان کے لئے "یاھُو" کا ذکر کافی ہے لیکن یہ کھلی ہوئی غلطی اور گمراہی ہے، اور ان کے اپنے ان دعاوی پر آیات قرآنی سے استدلال تو تحریف اور غلط بیانی کا شاہکار ہے۔ مثال کے طور پر ان کے بعض استدلالات کو لیجئے آیت قُلِ اللہُ ثُمَّ ذَرْھُمْ فِیْ خَوْضِھِمْ یَلْعَبُوْنَ سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

دیکھو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کہو "اللہ" معلوم ہوا کہ صرف "اللہ" "اللہ" کہنا ہی ذکر میں کافی ہے۔ لیکن ایک معمولی عقل وفہم کا آدمی بھی جس کو قرآنی تعلیمات اور عربی اسالیب سے ذرا بھی مس ہو سیاقِ کلام کو سامنے رکھ کر بادنیٰ تامّل محسوس کرسکتا ہے کہ لفظ "اللہ" یہاں تنہا نہیں ہے، بلکہ ایک پورے جملے کا ایک ٹکڑا ہے جس کو سیاقِ عبارت اور قرینہ مقالی کی بناء پر حذف کردیا گیا ہے کیونکہ استفہام کے جواب بالعموم اسی طرح دیئے جاتے ہیں کہ جملہ سوالیہ کے بیشتر الفاظ جن کو جواب میں دہرانا ہو، حذف کر دئے جاتے ہیں۔ اس جملہ کو اگر ظاہر کر دیا جائے تو یوں ہوگا کہ قلِ اللہُ الّذی انزل الکتاب الّذی جاء بہٖ موسیٰ۔ کیونکہ یہ قول ان یہودیوں کے رد میں ارشاد ہوا ہے جو نزولِ قرآن کے بارے میں کہتے تھے "مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ۔ یعنے اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری ہے۔" اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر حقیقت ہے کہ اللہ بشر پر اپنا کلام نہیں اتارا کرتا تو پھر بتاؤ "وہ کتاب جو موسیٰ لے کر تمہارے پاس آئے تھے کس نے اتاری تھی؟ (مَنْ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِہٖ مُوْسٰی)۔ پھر خدا خود ہی فرماتا ہے کہ "اے پیغمبر کہدو "اللہ نے" یعنے کتاب موسیٰ کو اللہ ہی نے نازل کیا تھا۔

اسم مضمر یعنے "یاہو" کو ذکر مشروع قرار دینے کے لیئے ان

لوگوں نے آیت وَ مَا یَعْلَمُ تَاوِیْلَہٗ اِلَّا اللّٰہُ کو اپنی تاویلاتِ فاسدہ کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ ان کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ "ہٗ" کی تاویل خدا اور راسخین فی العلم کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔" لیکن ظاہر ہے کہ کلامِ الٰہی کے ساتھ اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہو سکتا ہے جو یہاں اختیار کیا گیا ہے۔

الغرض لفظ مفرد کے ذریعہ، خواہ وہ ظاہر ہو یا مضمر (ہو) کا ذکر نہ تو سلف صالحین سے منقول ہے نہ پیغمبر نے اس کو مشروع قرار دیا ہے۔ کیونکہ ایک لفظ جملہ نہیں ہو سکتا جس کا کوئی مفید یقین مفہوم ہو اس لئے اس کو ایمان یا کفر کا مدار نہیں قرار دیا جا سکتا ایک لفظ صرف تصورِ مطلق پیدا کر سکتا ہے جس پر نفی یا اثبات کا حکم نہیں لگایا جا سکتا الّا آنکہ قلب میں پہلے سے کوئی ایسی معرفت اور حالت موجود ہو جو اس لفظ سے مل کر ایک متعین مفہوم پیدا کر دے ورنہ عام حالات میں لفظ مفرد قلب کو ایک مجرد تصور کے سوا کوئی مُفید یقین مفہوم نہیں بخشتا۔ اور شریعت نے جتنے اذکار تعلیم فرمائے ہیں وہ سب کے سب ایسے ہی ہیں جو بذاتِ خود، نہ کہ کسی غیر شئے کی مدد سے، مفید یقین معرفت پیدا کرنے والے ہیں۔ اس نے ہمیں اس قسم کے ذکر کی دو دھاری تلوار چلانے کی قطعی اجازت نہیں دی ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے یہ خطرناک کھیل کھیلا

انھوں نے اس تلوار سے خود اپنی گردنیں آپ کاٹ لیں، اور توحید و معرفتِ الٰہی کے مقامِ رفیع تک پہنچنے کی بجائے طرح طرح کے الحاد اور عقیدۂ اتحاد کے قعرِ ضلالت میں جا گرے۔ خصوصاً اسم مضمر یعنی "یاہو، یاہو" کا ذکر تو خوفناک فتنوں کا سرچشمہ ہے، اس طریقۂ ذکر کو طریقۂ نبوی سے کوئی دور کا علاقہ بھی نہیں بلکہ سرتاپا بدعت اور ضلالت ہے۔ کیونکہ جو شخص "یاہو، یاہو" کی رٹ لگاتا رہتا ہے اور ذاتِ باری کا استحضار تام نہیں لیتا اس کے اس مبہم قول میں "ہو" کی ضمیر کا مرجع صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو اس کے قلب میں پہلے سے متصور ہو اور یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ہر قلب کا ہر حال میں ذاتِ الٰہی کا صحیح تصور رکھنا اور نورِ حق سے معمور ہونا ضروری نہیں وہ کبھی گمراہ ہوتا ہے، کبھی ہدایت یاب، کبھی معبود اور معبودیت کا صحیح تصور رکھتا ہے اور کبھی غلط، اس لئے "یاہو" کہتے رہنے کے معنے لازمی طور پر اللہ واحد ہی کو پکارنے کے نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ جس ذات کو وہ پکار رہا ہے اس کا تصور اس کے ذہن میں اس تصور سے بالکل جداگانہ ہو جو اللہ وحدہٗ لاشریک کا ہے۔

پس یہ طریقۂ ذکر گوناگوں دشمنِ ایمان خطرات سے لبریز ہے اور کوئی ایک لفظِ تنِ تنہا دین میں کوئی اعتبار نہیں رکھتا اور جمہور اہلِ اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فقط ایک لفظ "اللہ" کہہ دینے پر ایمان کا حکم نہیں لگایا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ شریعت بیضاء

نے کسی کو لفظ مفرد کے ذریعہ ذکر کرنے کی اجازت نہیں دی ہے
یہاں قرآنِ مجید کی ان آیات سے وضو کا نہ لکھا نا چاہیے
جن میں "ذکر اسم رب" اور "تسبیح اسم رب کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن
آیات میں "ذکرِ اسم" سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ صرف "اللہ" کا لفظ
دہراتے رہو بلکہ خود قرآن کے مبلغ اور شارح نے اس "ذکر" کے مفہوم
اور طریقہ کی توضیح فرما کر ہمیں بتا دیا ہے کہ ان جملوں کا ورد کرو
جو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی تسبیح پر مشتمل ہوں۔ مثلاً جب آیت
فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلعم
نے فرمایا کہ "اس حکم پر رکوع میں عمل کرو" اور جب آیت سَبِّحِ اسْمَ
رَبِّكَ الْأَعْلَى" نازل ہوئی تو فرمایا کہ اس حکم پر سجدہ میں عمل کرو
" پھر ان احکام پر عمل کرنے کا طریقہ یہ بتایا کہ رکوع میں
سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ" اور سجدہ میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى
کہا جائے معلوم ہوا کہ اسمِ رب کی تسبیح سے مراد ایسے جملوں کا ورد
ہے جو اللہ تعالیٰ کی حمد اور پاکی کا مفہوم رکھتے ہوں نہ کہ فقط ایک
لفظ "اللہ" چنانچہ مسلمانوں کے لئے نمازوں، اذانوں، عیدوں
اور حج کے مراسم میں جو اذکار مقرر اور مشروع کئے گئے ہیں وہ
سب کے سب جملۂ تامہ ہیں نہ کہ۔ الفاظ مفردہ کا ذکر، خواہ وہ ظاہر
ہوں یا مضمر، سرے سے شریعت میں کوئی بنیاد ہی نہیں رکھتا
چہ جائیکہ اس کو خواصِ اولیاء اور عارفینِ کاملین کا ذکر خصوصی کہا جائے یہ

تو طرح طرح کی بدعتوں اور گمراہیوں کا سر چشمہ ہے۔

سلامتی دین کی راہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، دین کی بنیاد دو چیزوں پر ہے، ایک تو یہ کہ اللہ ہی کی بندگی کی جائے، دوسری یہ کہ اللہ کی بندگی اور عبادت اس طریقہ پر کی جائے جو مشروع ہو، نہ کہ بدعی طریقوں سے۔ یہی حقیقت ہے جو آیت ذیل میں واضح کی گئی ہے:۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝

سو جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کا اندیشہ رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ اچھے کام کرے اور اپنے رب کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے۔

اور پھر یہی وہ جمالِ معنی ہے جو شہادتین کے ظاہر و باطن میں جلوہ گر ہے۔ کلمۂ اول لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ میں اِس بات کا اقرار ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور کلمۂ ثانیہ یعنی محمدؐ رسول اللہؐ میں اِس کی شہادت ہے کہ محمدؐ ہی وہ پیامبر ہیں جنہوں نے معبود کے احکام ہم تک پہنچائے ہیں، اس وجہ سے ہمارے لیئے یہ ضروری ہے کہ اُن کے ارشادات کی تصدیق اور ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ خدا کے اس پیامبر نے اپنے فرائضِ نبوت کو ادا کرتے ہوئے اِن تمام

باتوں اور طریقوں کی روز روشن کی طرح وضاحت کر دی ہے جن کے ذریعہ ایک بندہ کو اپنے معبود کی عبادت کرنی چاہیئے اور ان تمام طریق عبادت سے روک دیا ہے جو من گھڑت ہوں اور جن کی اصل کتاب و سنّت میں نہ ملتی ہو۔ بنابریں جس طرح ہم اس امر کے مکلف ہیں کہ صرف اللہ ہی سے ڈریں، اسی پر ہر معاملہ میں بھروسہ رکھیں اسی سے مدد مانگیں اسی کو پکاریں اسی کو اپنی رغبتوں کا مرکز بنائیں اور صرف اسی کی بندگی کریں، اسی طرح ہمیں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ رسول کا اتباع کریں اس کے احکام کی بلا چون وچرا پابندی کریں اور اس کے نقوشِ قدم کو اپنا ہادی و رہبر بنائیں، حلال اُسے جانیں جس کو اس نے حلال گردانا ہو اور حرام اسے سمجھیں جس کو اس نے حرام ٹھیرایا ہو اور دین صرف اِس چیز کو مانیں جس کا اس کے قول و فعل میں نشان ملتا ہو

پورا قرآن انہی حقائق اور مبادیِ دین کی تشریحات سے بھرا ہوا ہے، اس کے جس ورق کو دیکھو عبادت اور عبودیت کا یہی مفہوم بے نقاب نظر آئے گا، عبادت، انابت خشیت، استعانت توکل، خوف اور تقویٰ کا جہاں بھی ذکر ہوگا ہر ایک کی نسبت اللہ جلّ مجدہٗ کی طرف ہوگی صرف دو چیزیں ایسی ہیں جن میں اللہ کے ساتھ اس کے رسول بھی شریک ہیں، ایک تو اطاعت، دوسری مُحبّت، یعنے اطاعت اور مُحبّت جس طرح خدا کی کرنی چاہیئے، اسی طرح ـــــ اس کی تبعیت میں ـــــ رسول کی بھی کرنی چاہیئے

باقی چیزوں میں رسول کسی معنی میں بھی اللہ کے شریک نہیں بلکہ عام انسانوں کی طرح خود وہ بھی اس پر مامور ہیں کہ اللہ ہی کی عبادت کریں، اسی پر بھروسہ رکھیں، اسی سے طلب اعانت کریں اور اسی کے حضور اپنی التجائیں پیش کریں۔ شیطان نے نصاریٰ وغیرہ کو اسی معاملے میں گمراہ کیا اور وہ اپنے انبیاء اور اولیاء کو ان کے صحیح موقف پر نہ رکھ سکے، بلکہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی مخصوص صفات میں انھیں بھی شریک کر دیا۔ انھیں سے دُعائیں اور التجائیں کرنے لگے اور انھیں پر توکل کرنے لگے۔ لیکن مومنین مخلصین کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی اور وہ صراط مستقیم پر چل کر مغضوبوں اور گمراہوں کے ملعون گروہوں میں شامل ہونے سے محفوظ رہے، اُنھوں نے دین کو اللہ ہی کے لئے خالص کیا اپنی پیشانیاں اسی کے آستانہ پر جھکائیں، اسی کو مصیبتوں میں پکارا، اسی سے اپنی امیدیں وابستہ کیں اسی کی بارگاہ میں عاجزانہ جُھکے، اپنے معاملات کو اسی کے حوالہ کر دیا اور ہر قدم پر اسی پر کامل بھروسہ رکھا پھر اس کے رسول کی اطاعت کی، ان سے محبّت کی ان کی تعظیم و تکریم کی، ان سے دوستی اور موالات کا رشتہ استوار کیا، کٹھن گھڑیوں میں اُن کے لئے جان کی بازی لگا دی، اپنے اعمال میں ان کی ہدایتوں پر کاربند رہے اور ان کے روشن کئے ہوئے چراغ لے کر زندگی کی منزلیں طے کیں۔

یہی وہ دین اسلام ہے جس کی تبلیغ و اشاعت کے لئے تمام انبیاء آتے رہے اور جس کے سوا اللہ کے دربار میں کوئی اور دین مقبول نہیں۔ اور یہی ہے عبادت کی حقیقت۔ اللہ تعالیٰ ہر مومن کو اس حقیقت کی کامل معرفت عطا فرمائے اور اس کے مُقتضیات کے مطابق اپنی اپنی زندگیاں ڈھالنے کا عزم اور استقلال مرحمت کرے۔

* * *